سلیم عباس
لیکچرار اردو، آرمی پبلک ڈگری کالج، ملیر کینٹ، کراچی

جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کا سیاسی پہلو: تنقیدی جائزہ

Abstracts

The Political aspects of Josh Malehabadi's Threnodies: A critical analysis

By Saleem Abbas, Lecturer Urdu, Army Public Degree College, Malir Cantt, Karachi.

Based on his charismatic creative faculties and poetic dimensions, the name of Josh Malihabadi holds a highly illustrious and radiant position in the history of Urdu literature. While Josh Malihabadi created valuable and invaluable literature in other genres of Urdu, he not only expanded the thematic scope of the Urdu *Marsiya* (elegy) but also aligned it with the demands of the modern era, due to which he is formally regarded as the founder of the modern *Marsiya*. Through his elegies, Josh endeavored to propagate the message of Imam Hussain (A.S) rather than focusing merely on his martyrdom; he emphasized the utilitarian aspects of the *Marsiya* more than the act of lamentation. He presented Imam Hussain (A.S) not merely as a religious leader, but as a 'Perfect Man' and a standard-bearer for revolutionaries. By utilizing the characters and events of Karbala as a backdrop, he successfully

sought to ignite a spirit of revolt among Indians against oppressive forces, particularly British Imperialism. In the present research paper, a critical review of Josh Malihabadi's *Marsiya* writing has been conducted in light of the intellectual and political situation of the modern era, with a specific focus on highlighting the political dimensions of his elegies.

Keywords: Josh Malihabadi, Political situation, twentieth century, sub continent Marsiya ،jadeed Marsiya, Imam Hussain,

---

کلیدی الفاظ: جوش ملیح آبادی ، بیسویں صدی ،برصغیر، سیاسی صورتحال، مرثیہ ، جدید مرثیہ ،امام حسین ،

اردو ادب کی تاریخ میں شبیر حسن خان، جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۴-۱۹۸۲) ایک ایسی عہد ساز شخصیت ہیں جن کی تخلیقی قوتوں اور شعری بصیرت نے انھیں ایک لازوال مقام عطا کیا۔ اگرچہ ان کی بنیادی پہچان ایک قادر الکلام شاعر کے طور پر ہے، تاہم ان کی ادبی خدمات کا دائرہ محض سخن وری تک محدود نہیں۔ تنقید نگاری، نشر نگاری، ادارت اور لغت نویسی جیسے شعبوں میں ان کے کارنامے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کے نزدیک ادب محض ایک وقتی مشغلہ نہیں تھا، بلکہ انھوں نے اسے زندگی گزارنے کے قرینے کے طور پر اپنایا۔ جوشؔ نے اپنی ۸۸ سالہ زندگی کے تقریباً ۷۵ برس اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے وقف رکھے۔

جوشؔ اردو نظم کے ستون مانے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں انھیں عوامی و ادبی حلقوں میں بے پناہ شہرت ملی، وہیں وہ ناقدین کی کڑی نکتہ چینی کا ہدف بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اکثر ایک متنازع قلم کار قرار دیا جاتا ہے۔ درحقیقت، بڑے فنکار اکثر بحث و

مباحثے کا مرکز بنتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی فکر سے نئے سوالات جنم دیتے ہیں اور رائج روایات سے انحراف کرتے ہیں، جس کی بنا پر قدامت پسند طبقہ ان سے نالاں رہتا ہے۔ ہر مبصر نے جوشؔ کے فن کو اپنی ذہنی اپج کے مطابق پرکھا، جس میں کچھ ان کی گہرائی تک پہنچ سکے اور کچھ کے لیے وہ ایک معمہ رہے۔

ان کی ذاتی زندگی یا افکار پر ہونے والے اعتراضات سے قطع نظر، یہ دعویٰ بلا خوف و تردید کیا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ کا نام اہم ترین شعرا کی فہرست میں نمایاں ہے۔ انھوں نے غزل، نظم، رباعی، مرثیہ اور سلام سمیت تمام اصنافِ سخن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور نثر و نظم دونوں میں اپنے ہمہ گیر نظریات پیش کیے۔ جوشؔ کی انفرادیت ان کے مخصوص مشاہدے، ان کے اٹھائے گئے منطقی سوالات اور مروجہ روایات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے میں پوشیدہ ہے۔ ان کا کلام فکری جستجو، ذہنی ریاضت اور ادبی سچائی کا ایک ایسا سنگم ہے جسے ان کی جدت طرازی اور مسلسل جدوجہد نے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔

جوشؔ کے مذہبی افکار

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے(۱)

کسی بھی تخلیق کار کی فکر کا ادراک کرنے کے لیے اسے محض ایک ہی پہلو سے دیکھنا کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زندگی کے متنوع رویوں اور مختلف جہتوں کو پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔ خاص طور پر جوشؔ جیسی ہمہ گیر اور رنگا رنگ شخصیت کے افکار کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے تمام گوشوں کا تعصب سے پاک ہو کر اور کشادہ ذہنی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

کسی بھی شخصیت کی حقیقی پرکھ کے لیے اس کے فطری میلانات اور جذباتی محرکات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر جوشؔ کے مذہبی کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے، تو ان کے حقیقی عقائد اور فکری رجحانات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے عام قارئین کے ساتھ ساتھ مبصرین نے بھی ان کے اس مذہبی شعری ذخیرے کو وہ اہمیت نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے برعکس، ان کی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" میں بیان کردہ چند رومانوی قصوں کو بنیاد بنا کر انھیں منکرِ خدا یا مذہب مخالف ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جوشؔ کے بارے میں اس منفی رویے کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ انھوں نے غیر منطقی عقائد، بے جا توہم پرستی، فرسودہ رسومات اور محض روایات پر مبنی حکایات کی سخت لفظوں میں نفی کی ہے۔ انھوں نے معاشرے کو ذہنی جمود سے نکال کر روشن خیالی اور عقل پسندی کی راہ دکھانے کی سعی کی۔ اپنی آپ بیتی "یادوں کی برات" میں "میرا دین" کے عنوان کے تحت جوشؔ نے اپنے مذہبی نظریات کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

> "جو اب تک مجھے مومن سمجھتے رہے ہیں وہ اپنے حسنِ ظن سے توبہ کرلیں کہ میرا دین خیابانِ ذہنِ انسانی کی تمنائے رنگ وبو، حصولِ علم و فقدان جہل کی آرزو اور محرکِ اولین کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"(۲)

مذکورہ بالا اقتباس جوشؔ کے فکری شرحِ صدر، بے باک صاف گوئی اور ان کی وسیع المشربی کا آئینہ دار ہے۔ ان کی خود نوشت "یادوں کی برات" کو اگر ایک طرف رکھ کر بھی دیکھا جائے، تو جوشؔ کا منظوم کلام اور ان کے افکار اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ انھوں نے زندگی بھر عقل پرستی کی شمع روشن رکھی۔ جوشؔ نے ہمیشہ موروثی عقائد اور لایعنی رسومات کو عقل و دانش

کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعیِ پیہم کی ہے اور اپنے قاری کو بھی اسی شعور کی تلقین کی ہے۔ ان کے اس فکری رویے اور عقل پسندی کی جھلک ان کی درج ذیل رباعیات میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے:

بوسیدہ روایات کی حرمت نہ کرو — تحقیق و تجسس کی اہانت نہ کرو
دینِ آباء بھی تم کو لاحق ہوجائے نہ — ماں باپ سے اتنی بھی محبت کرو(۳)

جوشؔ کے نزدیک انسانیت کی خدمت اور انسان دوستی ہی اصل دین اور ایمان ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ مخلوقِ خدا سے محبت ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو خالقِ حقیقی تک پہنچا سکتا ہے۔ جوشؔ کا نقطہ نظر روایتی نہیں؛ وہ مذہب کی عینک سے انسان کو پرکھنے کے بجائے، انسانیت کے وسیلے سے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے کے قائل ہیں۔ ان کے اس فکر و فلسفے کی عکاسی مندرجہ ذیل رباعی سے بخوبی ہوتی ہے:

کب سر پہ کسی نبی کا احسان لیا — رازِ کونین خود بخود جان لیا
انسان کا عرفان ہوا جب حاصل — اللہ کو اک آن میں پہچان لیا(۴)

جوشؔ کی خواہش تھی کہ انسان خود کو مسلکی گروہ بندیوں، مذہبی فرقوں یا مخصوص خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے فکری طور پر ہر قسم کی ذہنی غلامی اور پابندیوں سے نجات حاصل کر لے۔ وہ مذہب کے نام پر رائج تمام غیر منطقی رسومات اور فرسودہ طور طریقوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ان کے نزدیک کسی بھی سچائی کو محض اس لیے تسلیم کر لینا درست نہیں کہ وہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے، بلکہ وہ دین و مذہب کے معاملات میں بھی تحقیق کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ وہ یقین جو شعوری تلاش اور تحقیق کے نتیجے میں حاصل ہو، اس اندھی تقلید سے کہیں زیادہ معتبر ہے جو

صرف روایات کی بنیاد پر ہو۔ جوشؔ زندگی بھر سچے خالق کی معرفت کی جستجو میں رہے۔ درحقیقت وہ خدا کے وجود کے منکر نہیں تھے، بلکہ وہ اس روایتی اور محدود تصورِ خدا کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو مذہبی پیشواؤں (ملا) نے پیش کیا تھا۔ جوشؔ کے کلام میں اگر کہیں شک و شبہ کا رنگ نظر آتا ہے تو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے نہیں، بلکہ اس کا رخ مذہبی اوہام، بے جا عقیدت پسندی اور لکیر کی فقیری کی طرف ہے۔ وہ اسلام کو رسمی قیود اور بے معنی ضابطوں میں جکڑا ہوا دیکھنے کے مخالف تھے۔ انھوں نے خدا کے اس شخصی تصور کی بھرپور تردید کی جسے انسانی حاکموں اور بادشاہوں کے نقشِ قدم پر گھڑا گیا تھا۔ جیسا کہ راغبؔ مراد آبادی نے واضح کیا کہ جوشؔ نے دراصل اس "تصورِ خدا" کی نفی کی تھی جس کی بنیاد ملوکیت اور شاہی اطوار پر رکھی گئی تھی۔

جوشؔ نے اپنے کلام میں متعدد مقامات پر خدا کے اس روایتی اور 'شخصی تصور' کی نفی کی ہے جو انسانی تخیل کا ساختہ ہے۔

ہندو نے اگر علم کا مندر چھوڑا — مسلم نے بھی راستی کا منبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بت کو خدا — ملا نے خدا کو بت بنا کر چھوڑا(۵)

جوشؔ اس جبری تصورِ خدا کے منکر ہیں جو انسان کے فطری حقِ آزادی کو سلب کرنے کی بنیاد بنتا ہو۔ وہ ان مصلحت پسند 'مولویوں' کی کڑی مذمت کرتے ہیں جو ربِ کائنات کو (معاذ اللہ) ایک جابر اور قہار حکمران کے روپ میں پیش کر کے انسانی ذہنوں میں خوف اور غلامی کا بیج بوتے ہیں۔

اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

خدا تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے جب کہ انسانی عقل محدود ہے ایک لامحدود حقیقت ایک محدود شے میں کیسے سما سکتی ہے اس لیے

جوشؔ کے مطابق انسانی عقل اللہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان کی حقیقت کو سمجھا جائے پھر اللہ تعالی کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہو سکے گا۔

تجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا

جوشؔ کے دل میں انسانیت کے لیے جو بے پناہ ہمدردی اور تڑپ تھی، اسی کی بدولت انھوں نے ان تمام عظیم ہستیوں اور بانیانِ مذاہب کا ہمیشہ احترام کیا جنھوں نے انسانی شعور کو بیدار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ خاص طور پر رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، مولا علی علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی۔ حضورِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں جوشؔ کی دلی محبت اور عقیدت کسی تعارف کی محتاج نہیں؛ انھوں نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر کائنات کے اس عظیم ترین رہبر کی شان اور مرتبے کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق نظم "نحضورِ سرورِ کائنات" سے یہ چند اشعار ان کے قلبی لگاؤ کا بین ثبوت ہیں:

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری — رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری
خشک عرب کی ریگ سے لہر اٹھی نیاز کی — قلزمِ ناز حسن میں اُف رے تری شناوری
چھین لیں تو نے محفلِ شرک و خودی سے گرمیاں — ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری(۶)

انیس اشعار پر محیط یہ نظم جذبات کی ایک ایسی شدت اور

والہانہ پن کی آئینہ دار ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

جوشؔ نے جب اپنے فکری اصولوں کی روشنی میں انسانیت کے نجات دہندہ کی تلاش شروع کی، تو تاریخ کے صفحات میں انھیں امام حسین علیہ السلام کی وہ عظیم ہستی نظر آئی جو اپنے خاندان اور جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ حق کا علم بلند کرنے کے لیے ایک جابر حکمران کے سامنے سینہ سپر تھی۔ انھوں نے نواسۂ رسولؐ کی ذات سے ظلم و استبداد کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہونے کا ہنر سیکھا۔ جوشؔ نے اپنے پرتاثیر کلام کے ذریعے قوم کو یہ پیغام دیا کہ وہ امام عالی مقام کے ابدی کردار کو اپنا مشعلِ راہ بنائیں اور جبر و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

جوشؔ کے ادبی سفر کا آغاز ہی محرم الحرام سے جڑی یادوں سے ہوتا ہے؛ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں اپنی پہلی نظم "ہلالِ محرم" تخلیق کی، جس وقت ان کی عمر محض پندرہ سولہ برس تھی۔ یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ محرم کا مہینہ ان کے فکری و جذباتی نظام میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے "روحِ ادب" سے قبل جس تخلیق نے انھیں بطور شاعر شناخت عطا کی، وہ ان کا پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" ہی تھا۔

جوشؔ نے اپنی پسند اور مکمل شعوری وابستگی کے ساتھ مسلکِ تشیع اختیار کیا اور اسی نسبت سے وہ شبیر احمد خان سے شبیر حسن خان جوشؔ بنے۔ ان کے اس فیصلے پر کئی اہل قلم نے اپنے تحفظات اور اعتراضات کا اظہار بھی کیا، لیکن جوشؔ نے اپنی منفرد طبیعت اور امام حسینؑ سے اپنی والہانہ عقیدت کے زیرِ اثر مرثیہ نگاری کے سلسلے کو جاری رکھا۔ ان کے مرثیے کی ابتدا روایتی اور کلاسیکی اسلوب سے ہوئی، جس کی بہترین مثال "آوازۂ حق" ہے، جہاں کلاسیکی مرثیے کے تمام اجزائے ترکیبی موجود ہیں۔ اس مرثیے میں جہاں قدیم روایت کا پاس رکھا گیا ہے، وہیں آخر میں قوم کی زبوں حالی دور کرنے کے لیے امام حسینؑ سے استغاثہ بھی کیا گیا ہے۔ تاہم، بعد

ازاں انھوں نے "حسین اور انقلاب" جیسی معرکہ آرا نظم کے ذریعے قدیم مرثیے کی روایتی بندشوں کو توڑ کر جدید مرثیے کی بنیاد رکھی اور اس صنف کے بانیوں میں شامل ہو گئے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری

حضرت امام حسینؑ نے جو تاریخی اور منفرد کردار کربلا کے میدان میں ادا کیا ہے، اس سے تقریباً دنیا کا ہر ذی شعور، اس کا تعلق چاہے کسی بھی فرقےاور خطے سے ہو، متاثر نظر آتا ہے ۔اس بنا پر مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنے حساب سے اور اپنے انداز میں امام حسینؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس عظیم قربانی سے اپنا تعلق جوڑنے کی شعوری کوشش کی ہے ، لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ علم اور دانشور حضرات نے اس واقعے کو اپنی تحریروں اور مقالوں کی زینت بنایا ہے تو اہلِ منبر نے اپنی تقریروں میں اس واقعے سے رُشد و ہدایت لیتے ہوئے لوگوں کی فکر و شعور کی پرورش کے لیے استعمال کیا ہے ۔ جبکہ آزادی اور حُرّیت کی جدو جہد کرنے والوں نے اس سانحے کو نمونۂ عمل سمجھتے ہوئے، باطل اور ظالم و جابر قوتوں سے بر سر پیکار ہونے کا سبق حاصل کیا ہے۔تاریخِ انسانی کے اس عظیم واقعے کو جہاں دیگر گروہوں نے اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے، وہاں شعرا نے اس واقعے کے مختلف پہلوؤں کو اپنی غزلوں ، نظموں ، نوحوں ، سلام اور مرثیوں کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ تمام کلام جو سانحہ کربلا اور اس کے دلگداز مصائب کی عکاسی کرے، خواہ وہ غزل، سلام، نوحہ، قطعہ یا رباعی کی صورت میں ہو، اردو کے "رثائی ادب" کا حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ سے غالبؔ تک اور علامہ اقبالؔ سے فیض احمد فیضؔ تک، اردو شاعری کے تمام قد آور ستون کربلا کے آفاقی پیغام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان عظیم

شعرا کے ہاں کسی نہ کسی پیرائے میں تذکرۂ کربلا اور فکرِ حسینی کا عکس لازمی ملتا ہے۔ حتیٰ کہ عصرِ حاضر کے شعرا بھی اپنی اپنی تخلیقی بساط اور قلبی وابستگی کے مطابق کربلا کے متنوع پہلوؤں کو اپنی شاعری کا عنوان بنا رہے ہیں۔ ان نامور شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام نہایت معتبر ہے، جن کے مرثیے آج بھی اپنی انقلابی گونج کے باعث ادبی حلقوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور ہر دور کے استبدادی رویوں کے خلاف ایک توانا للکار ثابت ہوتے ہیں۔

بیسویں صدی کے مرثیے کا سیاسی اور فکری رجحان

انیسویں صدی کا وسطی عرصہ اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مابعد اثرات نے جن تہذیبی، سماجی اور ادبی تبدیلیوں کو جنم دیا، اس عہد کے باشعور تخلیق کاروں اور مبصرین نے انھیں نہایت گہرائی سے محسوس کیا۔ ان انقلابی حالات کے اثرات براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہر علمی شعبے پر مرتب ہوئے۔ جہاں اس بدلتے ہوئے منظر نامے نے محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ اور علامہ شبلی نعمانیؔ جیسے صاحبانِ بصیرت کی تنقیدی سوچ کو مہمیز کیا، وہیں مرثیے سمیت شاعری کی دیگر تمام اصناف بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ غزل اور نظم کے افق پر غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری جولانیاں بھی، دانستہ یا غیر دانستہ طور پر، مرثیے کی صنف کو جدید رنگ میں ڈھالنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ غالبؔ کے کلام میں موجود سوال اٹھانے کا انداز اور ان کے منفرد لب و لہجے نے اس دور کی مجموعی شاعری پر گہرے نقوش چھوڑے اور تخیل کی نئی راہیں متعین کیں۔ ان جدید فکری لہروں کے اثرات خود میر انیسؔ جیسے عظیم مرثیہ نگار کے کلام میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اگر بعدِ غالبؔ غزلوں اور بعدِ انیسؔ مرثیے پر نظر ڈالیں تو ان دو عظیم شعرا کی شاعری کے اثرات جدید مرثیے میں نمایاں نظر آئیں گے۔انیسؔ کے بعد جدید مرثیے کے باب میں شاد عظیم آبادیؔ

قابلِ ذکر ہیں۔ شادؔ نے اپنے مرثیوں سمیت اپنی غزلوں میں جدید رجحان اور جدید طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے ۔ اُردو میں بہت کم مرثیہ گو شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اس طرف فکر کے ساتھ شعوری طور پر مرثیے میں انقلابی تبدیلیوں کے متعلق سوچا ہو۔

اردو مرثیے کے تاریخی ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس صنف میں جدیدیت کے ابتدائی نقوش مرزا اوجؔ لکھنوی کے ہاں ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پہلی مرتبہ عمل کی ترغیب اور انقلابی سوچ کا سراغ ملتا ہے، تاہم اس وقت تک مرثیے کا یہ بدلتا ہوا انداز قومی آزادی کی باقاعدہ پکار میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ جب اردو مرثیہ بیسویں صدی کی دہلیز پر پہنچا تو اسے بالکل نئے سیاسی اور سماجی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور میں وقت کی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کو ترجیح دینے کا رجحان غالب آگیا۔ ان جدید رجحانات کی ترویج اور انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کروانے کے لیے فنی لحاظ سے اردو نظم کو اظہار کا بنیادی وسیلہ بنایا گیا جبکہ ۱۹۰۵ء کے بعد مسلمانوں کی مایوسی کا دور ختم ہوا، اور آزادی کو ایک امکانی نصب العین سمجھ کر انگریز سامراج سے نجات کے لیے مہم تیز کردی گئی مسلمانوں کی اس سرگرم عملی تحریک کے ساتھ ساتھ ہی تحریکِ خلافت کا بھی آغاز ہوگیا ، جس نے انقلاب کے تصور کو ایک مذہبی اور اخلاقی جواز بھی عطا کیا ۔ اس ابھرتے ہوئے انقلاب اور قومی تحریک میں نئی روح پھونکنے کے لیے اہلِ قلم کے افکار فطری طور پر معرکہ کربلا کی جانب مڑ گئے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، مولانا ابوالکلام آزادؔ اور علامہ اقبالؔ جیسی قد آور شخصیات نے واقعۂ کربلا کے انقلابی اور حریت پسندانہ پہلوؤں کو ازسرِ نو اجاگر کرنے کی سعیِ مشکور شروع کر دی۔ ان اکابرین کی فکری رہنمائی اور شعری بصیرت کے نتیجے میں اردو مرثیہ محض روایتی حدود سے نکل کر ایک نئے عہد میں داخل ہوا اور یوں 'جدید مرثیہ' کی مضبوط بنیادیں استوار ہونے

لگیں۔

تحریکِ آزادی کی بڑھتی ہوئی شدت کے دوران بعض حلقوں کا یہ خیال تھا کہ ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنا ترقی پسندی کے منافی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کی یادیں کوئی اجنبی شے نہیں ہوتیں بلکہ تاریخ کا شعور انسان کے اندر انسانیت کے جذبے کو جلا بخشتا ہے۔ تاریخ سے وابستہ یہی فکری شعور انسانی ارادوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس فلسفیانہ نکتے کی بہترین تشریح علامہ اقبالؔ نے کی؛ چنانچہ اقبالؔ اور مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے بلند پایہ شعرا نے اپنی تخلیقات میں محض کربلا کے واقعات کو دہرانے کے بجائے شہادتِ حسینؑ کے پسِ پردہ اسباب اور اس کے دور رس اثرات کو اجاگر کرنے پر توجہ دی۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں معرکہ کربلا اور امام عالی مقام کے کردار کو اسلامی فلسفے اور ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ جس منفرد انداز میں سمویا ہے، وہ قدیم مرثیہ نگاری کی روایات سے یکسر مختلف ہے۔ اقبالؔ کی نظر میں کردارِ حسینؑ میں ظاہری جنگ سے زیادہ روحانی جمال، ہتھیاروں سے زیادہ جذبوں کی قوت اور ضربِ شمشیر سے زیادہ سجدے کی تاثیر نمایاں ہے۔ شہادتِ حسینؑ اور سانحۂ کربلا کو اقبالؔ نے جو فکری رفعت اور وسعت عطا کی، وہ اردو ادب میں ایک نہایت قیمتی اور گراں قدر سنگِ میل ہے۔قیامِ امام حسینؑ کے حوالے سے اقبالؔ کے درج ذیل اشعار اس نئی جہت کی عکاسی کرتے ہیں، جن کی گونج جدید مرثیے کے فن میں صاف سنائی دیتی ہے:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ　　بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

غریب و سادہ و رنگیں ہے　　نہایت اس کی حسینؑ ،
داستانِ حرم　　ابتدا ہے اسماعیل(۷)

علامہ اقبالؔ کی جاہ و جلال سے بھرپور نظمیہ شاعری نے اردو مرثیے کے ڈھانچے میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے ایک منفرد

فکری جہت اور انقلابی لب و لہجے سے متعارف کروایا۔ اقبالؔ کے اس اسلوب نے مرثیے کو محض گریہ و زاری سے نکال کر ایک مزاحمتی رنگ عطا کیا۔ اسی فکر کی ایک توانا لہر مولانا محمد علی جوہرؔ کے کلام میں بھی نمایاں نظر آتی ہے، جنھوں نے مرثیے کو ایک نیا ولولہ بخشا۔ ان کے درج ذیل اشعار اس قدر مقبول ہوئے کہ آج وہ زبان زدِ عام ہیں:

دورِ حیات آئے گا قاتل کی قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد(۸)

یہ اشعار غزل کے ہیں، لیکن ان میں بھی معرکہ کربلا کے سیاسی مفاہیم اپنے تمام تر استعاراتی شکوہ کے ساتھ رچ بس گئے ہیں۔ انفرادی جذبے کی یہ صنف، کربلا کے آفاقی استعارے کو جذب کر کے ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی ہے۔ بعد ازاں، جدید اردو غزل کے منظر نامے پر تو کربلا محض ایک تاریخی واقعہ نہیں رہی، بلکہ ایک مکمل اور توانا استعارے کے طور پر ابھری ہے۔

بیسویں صدی کے تقاضے اور جوشؔ کا مرثیہ

جوشؔ ملیح آبادی بلاشبہ بیسویں صدی کے 'شاعرِ اعظم' ہیں۔ فکری گہرائی اور فنکارانہ مہارت کے اعتبار سے علامہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ ہی وہ شخصیت ہیں جو قادر الکلامی، ہمہ جہتی اور وسعتِ خیال میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی بے مثال شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں انھیں 'شاعرِ انقلاب'، 'شاعرِ شباب' اور 'شاعرِ فطرت' جیسے القابات اور متعدد اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا۔ جوشؔ نے اردو کی تقریباً تمام اصنافِ سخن میں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، بالخصوص جدید اردو نظم کا باب تو ان کے تذکرے اور فنی فتوحات کے بغیر ادھورا

ہے۔

جہاں جوشؔ نے نظم کے میدان میں نئے آفاق دریافت کیے، وہیں انھوں نے اردو مرثیے کو بھی ایک نئی زندگی اور اوجِ کمال عطا کیا۔ انھوں نے روایتی حدود سے تجاوز کر کے 'جدید اردو مرثیہ' کی بنیاد رکھی اور اس صنفِ سخن کو وہ منفرد مقام دلایا جو اس سے قبل مفقود تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، علامہ اقبالؔ اور مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے اکابرین نے سانحۂ کربلا کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنا کر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کے انقلابی پیغام کو عام کرنے کی جو ابتدا کی تھی، جوشؔ نے اسے ایک باقاعدہ فنی اسلوب اور مستقل دبستان میں تبدیل کر دیا۔ تاہم، ان حضرات نے اس مقصد کے لیے نظم اور غزل کی اصناف کو وسیلہ بنایا۔ ان کے برعکس، جوشؔ ملیح آبادی نے کربلا کے ان انقلابی گوشوں کو مرثیے کی روایتی صنف یعنی 'مدس' کی ہیئت ہی میں ڈھال کر پیش کیا اور اسے 'جدید مرثیہ' کا عنوان دیا۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی بنا پر جوشؔ کو جدید مرثیہ نگاری کا بانی اور موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔

جوشؔ نے اردو مرثیے کو مخصوص اور محدود دائروں سے نکال کر عہدِ حاضر کے وسیع تناظر میں پیش کیا، جس سے اس صنفِ سخن کو ایک نئی جہت اور آفاقیت عطا ہوئی۔ انھوں نے مرثیے کی اہمیت کو ایک نئے نقطہ نظر سے واضح کرتے ہوئے کہا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ
(۹)

جوشؔ کی مرثیہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا گہرا سماجی اور سیاسی شعور ہے۔ وہ اپنے عہد کے ذہنی میلانات، جدید تہذیب کے تقاضوں، نئی نسل کے زاویہ نظر اور تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی و سیاسی مطالبات اور ان سے جنم لینے والے مسائل پر بڑی گہری اور

باریک بین نظر رکھتے تھے۔

جوشؔ کا زمانہ عالمی سطح پر عظیم انقلابات اور تبدیلیوں کا دور تھا۔ ایک طرف پہلی جنگِ عظیم کے مہیب سائے ابھی چھٹے ہی تھے کہ دوسری عالمی جنگ کے لیے زمین ہموار ہونے لگی، جبکہ دوسری جانب برصغیر کا ذرہ ذرہ آزادی کی تڑپ میں بے قرار تھا اور حصولِ آزادی کے لیے بھرپور جدوجہد جاری تھی۔ ان دگرگوں حالات میں جوشؔ نے امام حسین علیہ السلام کے لازوال اور انقلابی کردار کو بیداریِ نو کے ایک موثر ذریعے کے طور پر پیش کیا اور اس مقصد میں وہ مکمل طور پر کامیاب رہے۔ اس عہد میں جوشؔ کی مجموعی شاعری اور خاص طور پر ان کے مراثی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ محض فن برائے فن کے قائل تھے اور نہ ہی ان کا کلام صرف روایتی عقیدت کا مرہونِ منت تھا۔ بلا شبہ عقیدت ایک پس منظر کے طور پر موجود ہو سکتی ہے، لیکن ان کی شاعری کا اصل محرک ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور دنیا بھر میں ابھرنے والی انقلابی تحریکیں تھیں۔ جوشؔ نے اپنی سیاسی بصیرت اور فکری بلندی کے ذریعے مرثیے کو صرف مذہبی عقیدت تک محدود رکھنے کے بجائے اسے عملی زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے مرثیے کے روایتی 'ماتم' کو ایک انقلابی 'تلاطم' میں بدل دیا اور اسے انفرادی ثواب کے حصول کے بجائے اجتماعی جدوجہد اور جہاد کا ناگزیر حصہ بنا دیا۔ اس طرح انھوں نے مرثیے کے ذریعے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے اور ان کی کردار سازی میں ایک تاریخی اور کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا یہ شعر ان کے اس نظریے کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے:

ہمتِ نوعِ بشر کی انتہا ہے کربلا
تو سمجھتا ہے فقط ماتم سرا ہے
کربلا(۱۰)

جوشؔ کی بلند خیالی اور کمالِ فن کا اصل جوہر یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے جیسی روایتی اور خالص مذہبی صنف کو آزادی، حریتِ فکر اور ترقی پسند رجحانات سے ہم آہنگ کر دیا۔ یہ اردو مرثیے کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ جذباتیت کی جگہ عقل و استدلال نے لی، رقت کی جگہ ہمت و ولولے کو ملی اور مرثیہ ماضی کے نوحے کے بجائے حال کا آئینہ دار بن گیا۔ یہ تمام تر تبدیلیاں جوشؔ کی انقلابی مرثیہ نگاری ہی کا ثمر ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عام سامعین کے شعور کو معرکہ کربلا کے وسیلے سے اپنی آزادی کی جنگ سے جوڑ دیا۔ ان کی شاعری نے لوگوں کو عیش و عشرت کی زندگی سے متنفر کر کے جبر و استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے پر آمادہ کیا۔ جوشؔ نے اپنی مرثیہ نگاری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا اور یہ فلسفہ عام کیا کہ واقعۂ کربلا محض ایک مذہبی واقعہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا المیہ اور حریت کا آفاقی سبق ہے۔

فنی نقطہ نظر سے بھی جوشؔ کے مراثی میں زبان و بیان کی وہ ندرت اور تخیل کی وہ بلندیاں نظر آتی ہیں جو ان سے قبل اس صنف میں قدرے مفقود تھیں۔ روایتی مرثیہ نگاروں کا زور زیادہ تر کردار نگاری، منظر کشی اور جذبات نگاری پر ہوتا تھا، مگر جوشؔ نے اپنے مرثیے کو فکری گہرائی اور تخیلی تاثرات کی معراج عطا کی۔ چونکہ جوشؔ کا ورود اس میدان میں کسی مخصوص مذہبی عقیدت کے بجائے حریتِ فکر، انسان دوستی اور عقل پرستی کے تحت ہوا تھا، اسی لیے ان کے ہاں روایتی گریہ و زاری اور اجزائے مرثیہ کی جامد پابندی نظر نہیں آتی۔ ان کے مراثی کا حقیقی مرکز و محور امام حسینؑ کا وہ لازوال اور بے مثال انسانی کردار ہے جس کے کمالات کو وہ ایک انقلابی فلسفے کے طور پر اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب کلاسیکی مرثیے کے برعکس بیانیہ کے بجائے مبصرانہ اور مفکرانہ ہے۔

جوشؔ کے دور میں لکھنؤی مرثیہ گو اور ان کے تابعین جو اپنے ماحول اور رسومات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے ، واقعۂ کربلا کو مرثیوں میں

اس اسپرٹ کے ساتھ پیش کرتے تھے جس طرح ان کے پیش رو مرثیہ گویوں نے کیا تھا اور یہی انداز اور طریقہ اس دور کے مرثیہ کے سامعین کو مرغوب تھا کہ امام حسینؑ پر آہ و بکا کرنا ہی مرثیے کا اصل مقصد ہونا چاہیے اور ذاکروں اور مولیوں کا طبقہ بھی اس کی تائید کرتا تھا ، جبکہ جوشؔ اور ان کے تابعین اور ہم خیالوں نے اس کے بر عکس شعوری طور پر مرثیے کو احتجاج سے روشناس کیا۔ ان مرثیہ گویوں میں جمیلؔ مظہری، صباؔ اکبر آبادی، اور کیفیؔ اعظمی جیسے مرثیہ گو خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان مرثیہ گویوں میں مرثیہ گوئی کے احتجاجی پہلو کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ امام حسینؑ کی شہادت محض ایک مذہبی شخصیت اور رہنما کی شہادت نہیں ہے بلکہ یہ اقدارِ انسانیت ، اعلیٰ ظرفی اور انسانیت کے عزت و احترام سے زندہ رہنے کے تمام اصولوں کی بھی شہادت ہے ۔ اور جس کی حفاظت تمام نوعِ انسانی کا فریضہ ہے ، لہٰذا یہ غم کسی فرد گھرانے یا فرقے کا غم نہیں بلکہ یہ غم عالمِ انسانیت کا غم ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی سیاسی افراتفری کی فضا ،جو جنگِ آزادی کے سلسلے میں ہندوستان میں عام ہورہی تھی ،اس نے بھی نئے مرثیہ نگاروں کو سیاسی اور سماجی پہلو کی طرف متوجہ کیا۔

بیسویں صدی کے اس سیاسی گہما گہمی کے دور میں روایتی مرثیے بھی مجالس اور محافل میں جاری رہے مگر یہ مرثیے کوئی سماجی قوت نہیں رکھتے تھے کیوں کہ ان تمام روایتی مرثیہ گویوں کی نظر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ اور ان کے تابعین مرثیہ گویوں پر تھی ۔ اگر چہ ان مرثیہ گو شعرا نے بھی روایتی مرثیہ گوئی میں کچھ ایجادات اور اقدام کی کوشش کی کچھ بہاریہ مضامین ، کچھ تغزّل اور کچھ حالاتِ زمانہ کے حوالے سے بھی مرزا اوجؔ اور نسیم امروہوی کی طرح ہلکے پھلکے اشارے بر سبیلِ تذکرہ کرتے رہے ، لیکن مرثیے میں ان سے کسی اجتماعی تحریکی صورت کا پتا

نہیں چلتا۔ کیوں کہ ان تمام روایتی مرثیہ گویوں کا مقصد مرثیہ کو فنی طور پر عروج دینا تھا لہٰذا اس دور کے یہ شعرا میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو معیار بنا کر مرثیہ گوئی کرتے تھے جبکہ جوشؔ کے مرثیے " حسینؑ اور انقلاب" کے ساتھ مرثیہ کے سماجی تار و پود میں پہلی بار ہندوستان میں ہونے والے انقلاب کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے ، جس میں احتجاج اور انقلاب کی صورت بہت واضح دکھائی دیتی ہے،جبکہ اس کے ہلکے پھلکے اشارے جوشؔ ، اپنے پہلے مرثیے " آوازۂ حق" میں کافی عرصہ پہلے کر چکے تھے۔

وہ طبقہ جو ادب کو عملی زندگی کا عکاس تسلیم کرنے کے بجائے اسے محض حظِ نفس اور محفل آرائی کا وسیلہ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک مرثیہ صرف واقعاتِ غم کے اظہار اور مصائبِ اہلِ بیتؑ کے بیان تک محدود ہے۔ ایسے حلقوں کا یہ خیال ہے کہ مرثیہ جیسی صنف کا کسی مخصوص فکر، سیاسی نظریے یا تہذیبی و سماجی تغیرات سے کوئی منطقی تعلق نہیں ہو سکتا۔ ان کے مطابق مرثیہ ایک خالص مذہبی صنف ہے جس کا مقصد محض گریہ و زاری اور حصولِ ثواب ہے، لہٰذا اسے دنیا کے معاصر مسائل اور پیچیدہ حالات سے جوڑنا بے سود ہے۔

تاہم، حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے؛ ادب جس انسانی سماج میں جنم لیتا ہے، اگر وہ ان انسانوں کی تہذیبی زندگی، ان کے فکری رویوں اور گرد و پیش کے حالات سے لاتعلق رہے تو ایسا ادب اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ مرثیہ تو محض ایک صنفِ سخن نہیں بلکہ 'ادبِ عالیہ' کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس حقیقت کا بین ثبوت یہ ہے کہ دکن سے شمال تک اور دہلی سے لکھنؤ تک، مرثیہ نگاری کے طویل سفر میں جو بھی ادبی، تہذیبی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ہر دور کے مرثیہ نگاروں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلام میں ان کی واضح تصویر کشی کی ہے۔ یوں مرثیہ ہر عہد کے سماجی و تہذیبی شعور کا ایک مستند آئینہ دار ثابت ہوا ہے۔

جوشؔ کا زمانہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کا عروج تھا۔ اس عہد میں سیاسی بے چینی کے باعث عوام سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ان کے قلوب آزادی کے نعروں اور ولولہ انگیز صداؤں کی جانب راغب تھے۔ ایسے پرآشوب حالات میں عوامی شعور اور فکری رخ کو متاثر کرنے کے لیے معرکہ کربلا سے زیادہ موزوں اور طاقتور کوئی دوسرا موضوع نہیں ہو سکتا تھا۔ جوشؔ جیسے انقلابی شاعر نے اس صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مرثیے کے روایتی ڈھانچے کو ایک نیا انقلابی موڑ دینے کا حتمی فیصلہ کیا۔ جوشؔ نے اپنے مراثی میں جو گھن گرج، للکار اور خطیبانہ رنگ پیدا کیا، اس نے عوام کے جذبوں میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ تاہم، مرثیے کے اس باعیانہ اسلوب اور جوشِ بیان نے روایتی مرثیہ نگاروں، ذاکرین اور حدیث خوانوں میں تشویش پیدا کر دی اور وہ ان کی اس جدت پسندی کے سخت مخالف ہو گئے۔ جب مرثیے کے پردے میں اس نوعیت کے انقلابی اشعار منظرِ عام پر آئے تو گویا ایک نیا فکری محاذ کھل گیا:

پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہر یار — پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار

اے زندگی جلالِ شہ مشرقین دے — اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

ذوقِ فساد و ولولہ شر لیے ہوئے — پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے(۱۱)

جوشؔ کے اس باعیانہ اسلوب پر مخالفت کی تین بڑی لہریں اٹھیں۔ ایک طرف مذہبی طبقہ اس بات پر برہم تھا کہ ان مراثی میں روایتی "بکا" (گریہ و زاری) کا پہلو کہاں گیا؟ ان کا اعتراض یہ تھا کہ امام حسین علیہ السلام کی جدوجہد کو محض ایک سیاسی رہنما کی تحریک

بنا کر پیش کرنا ان کی روحانی عظمت کے منافی ہے۔ نیز، وہ "کربلائے نو" جیسی اصطلاحات کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ ان کے نزدیک کربلا کی تاریخی حیثیت یکتا تھی۔ دوسری جانب وہ شعرا تھے جو جوشؔ کی فکری بلندی اور ان کے وسیع لسانی ذخیرے کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے؛ ان لوگوں نے جوشؔ کے فن کو مرثیے کے بجائے محض ایک "مدرس" قرار دے کر ان کی قدر کم کرنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ امرا اور جاگیرداروں کا تھا، جو جوشؔ کی شاعری میں موجود مساوات اور ملوکیت مخالف نظریات کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

ان تمام رکاوٹوں اور اعتراضات کے باوجود، ترقی پسند سوچ کے علمبرداروں نے ان تنقیدوں کی کوئی پروا نہیں کی۔ نئی نسل، جو ذہنی طور پر جوشؔ کے خیالات کے ساتھ ہم آہنگ تھی، نے مرثیے کے اس نئے آہنگ کو دل وجان سے تسلیم کیا اور یہی اسلوب جدید مرثیے کا سنگِ بنیاد بنا۔ اب مرثیہ محض بے بسی اور مظلومیت کے اظہار تک محدود نہ رہا، بلکہ یہ عمل کی پکار اور سرفروشی کا تقاضا بن گیا۔ اس نئی لہر نے قوم کو سکھایا کہ امام کی مظلومیت پر صرف آنسو بہانا کافی نہیں، بلکہ ہمت اور جواں مردی کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں باطل کے خلاف سینہ سپر ہونا اصل مقصد ہے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں مرثیہ خالصتاً جذباتیت کے حصار سے نکل کر عقل اور منطق کی بنیادوں پر استوار ہوا، تحریکِ آزادی کے جوش و خروش نے جوشؔ کے لہجے میں وہ گونج اور للکار پیدا کر دی جو اس عہد کی اشد ضرورت تھی۔ انھوں نے روایتی مراثی کے 'رجز' سے ہٹ کر ایک ایسا اچھوتا اور توانا اسلوب وضع کیا جس میں جدوجہدِ آزادی اور حریتِ فکر کے سامنے موت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ جوشؔ نے کربلا کے ان بہتر (۷۲) نفوس کے عظیم کارنامے کو حریت پسندی کا ایسا مینارۂ نور بنا دیا جس کی روشنی میں غلامی کی زنجیریں پگھلنے لگتی ہیں۔ ان کے ہاں رجز محض ایک جنگی روایت نہیں بلکہ باطل کے خلاف ایک ابدی للکار بن گیا ہے۔

جوشؔ کے معرکہ آرا مرثیے "موجد و مفکر" کا یہ بند ملاحظہ کیجیے، جس میں حریت کا یہی رنگ نمایاں ہے:

کردیا تو نے یہ ثابت اے زندگی کیا، موت سے لیتا ہے ٹکر
دلاور آدمی آدمی

کاٹ سکتا ہے رگِ گردن سے لشکروں کو روند سکتے ہیں
خنجر آدمی بہتر آدمی

ضعف ڈھا سکتا ہے قصرِ افر و اورنگ کو
آبگینے توڑ سکتے ہیں حصارِ سنگ کو(۱۲)

جوشؔ کے نزدیک سانحۂ کربلا محض ایک مذہبی گروہ یا مسلمانوں تک محدود المیہ نہیں ہے، بلکہ وہ اسے پوری نوعِ انسانی کا ایک مشترکہ دکھ اور آفاقی المیے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جوشؔ کا یہ وسیع زاویہ نظر ان کی منطقی سوچ، انسانی وقار کی پاسداری اور روشن خیالی کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی فکر میں انسان کا وہ بلند ترین تصور پایا جاتا ہے جس کی بنیاد خالصتاً انسانیت سے محبت پر رکھی گئی ہے۔ جوشؔ کی 'حسینؑ شناسی' روایتی عقیدت کی لکیر پر چلنے کے بجائے محبت، بھائی چارے، انسان دوستی اور پیہم جدوجہد کے عالمگیر اصولوں کے ذریعے نسلِ انسانی کو متاثر کرتی ہے۔ انسان کی عظمت، اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں، اس کی انتھک محنت اور روشن افکار کی جو جاندار عکاسی جوشؔ کے مرثیوں میں ملتی ہے، اس کی مثال نہ تو کسی قدیم مرثیے میں نظر آتی ہے اور نہ ہی اردو نظم کے وسیع ذخیرے میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ اس فکری شعور کی بہترین مثال جوشؔ کا شاہکار مرثیہ "عظمتِ انسان" ہے، جس کے یہ اشعار ان کے اس نظریے کی مکمل وضاحت کرتے ہیں:

کرۂ ارض و سما کھول رہا ہے اس خموشی میں فقط بول رہا ہے
انساں انساں

حاکمِ کون و مکاں ، ناظم دوراں انساں — خاک اک رحل سبک سیر ہے قرآں انساں

خطبۂ حضرتِ خلاق کا منبر انساں — انتہا یہ کہ محمدؐ سا پیامبر انساں(۱۳)

قدیم مرثیہ نگاری کے مطالعے سے ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے کہ ان میں جہاں ایک طرف ملوکیت اور افسر شاہی کی مخالفت ملتی ہے، وہیں دوسری جانب شاہی رہن سہن اور امارت کے طور طریقوں کے لیے ایک نوع کی پسندیدگی بھی موجود ہے۔ اس کے برعکس، جوشؔ کے مرثیوں میں شاہانہ اطوار یا درباری تہذیب کے اثرات کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جوشؔ کا زمانہ شاہی عہد سے بہت دور تھا اور اصولی طور پر اسلام میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں (اگرچہ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے امرا نے بادشاہت کا راستہ اپنایا، جس کا آغاز امیر معاویہ کے دور سے ہوا)۔

عالمی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ یا جنگ ہو جسے کربلا کی مانند اتنی کثرت اور متنوع زاویوں سے پیش کیا گیا ہو۔ اردو شاعری اور بالخصوص مرثیے میں 'کربلا' کا لفظ بطور استعارہ، پیاس کی شدت کی علامت یا محض مصائب کے بیان کے لیے کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ تاہم جوشؔ کے ہاں کربلا کا تصور محض علامتی نہیں بلکہ نہایت ٹھوس اور عملی ہے۔ ان کے کلام میں کربلا کہیں بلند کرداری کی پہچان ہے، کہیں اسوۂ حسینؑ کی پیروی کا نام ہے، اور کہیں حق تلفی، ناانصافی اور آمریت سے ٹکرانے کا استعارہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ جوشؔ کے بیان کردہ کربلا کے تصور میں شکست کا احساس یا افسردگی کا سایہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک امام حسینؑ کی ظاہری شہادت دراصل ان کے مقصد کی عظیم فتح تھی، جو انسانیت کو سرفرازی، ہمت اور فخر کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ بند ملاحظہ کریں :

اے محمدؐ! موت وہ تیرے آج تک جس سے درخشاں
نواسے کو ملی ہے ضمیرِ آدمی
اللہ اللہ روشنی تیرے کربلا کی دھوپ پر چھٹکی ہے
چراغِ ذہن کی اب تک چاندنی
یہ اَنی پر سر نہیں، تیری انا کا تاج ہے
کربلا تیرے نظامِ فکر کی معراج ہے
ہمتِ نوعِ بشر کی انتہا ہے تو سمجھتا ہے فقط ماتم سرا ہے
کربلا کربلا(۱۴)

جوشؔ کی پیش کردہ کربلا محض مظلومیت کی داستانیں سنانے اور گریہ و زاری کرنے تک محدود نہیں، بلکہ یہ ظلم کا منہ توڑ جواب دینے اور باطل کے خلاف سینہ سپر ہونے کا ایک ابدی استعارہ ہے۔ ان کے مراثی شہدائے کربلا کی حقیقی پیروی کا وہ جذبہ بیدار کرتے ہیں جس کے تحت حق کی خاطر لڑنے والے مٹھی بھر جاں باز بھی باطل کے عظیم لشکروں کو روندنے کی ہمت پا لیتے ہیں۔ جوشؔ نے 'بہتر (۷۲) نفوس' کے تاریخی معرکے کو ایک ایسی ہمت اور ولولے میں ڈھال دیا ہے جو قاری کو بے بسی کے حصار سے نکال کر عملِ پیہم کی راہ دکھاتا ہے اور اسے یہ یقین دلاتا ہے کہ اگر ارادہ صلب ہو تو قلتِ تعداد کبھی بھی مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

جوشؔ کی حسین شناسی

جوشؔ نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات " میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے لیکن جوشؔ کے دو عشق ایسے بھی ہیں جن کا ذکر انھوں نے براہ راست نہیں کیا لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے ۔ ان میں پہلا عشق وہ ہے جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا کہ :

گُل پر ہیں نقوشِ دست باری جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب
اب تک تک

انساں کی پیمبری کا در ہے فطرت کی پیامبری ہے
مسدود جاری اب تک

یعنی فطرت کا عشق ان کے کلام سے جھلکتا ہے ۔ جبکہ ان کا دوسرا عشق ایک ایسی شخصیت تھی جس نے ان کے کلام کو باطل قوتوں کے خلاف ایک مستقل اعلانِ جنگ کا درجہ عطا کیا اوران سے کہلوایا:

اوہام کو ہر قدم پہ ٹھکراتے ہیں ادیان سے ہر گام پہ ٹکراتے ہیں
لیکن لیتا ہے جب کوئی نامِ حسینؑ ہم اہلِ خرابات بھی جھک جاتے ہیں(۱۵)

جوشؔ کی شخصیت میں امام حسین علیہ السلام کے لیے جو عقیدت پائی جاتی ہے، اس کی بنیاد محض مذہبی وابستگی نہیں تھی، بلکہ انھوں نے نواسۂ رسولؐ کے کردار کا مطالعہ خالصتاً فکری اور شعوری سطح پر کیا تھا۔ امامِ عالی مقام کی ذات کے جس پہلو نے جوشؔ کو سب سے زیادہ اپنی جانب راغب کیا، وہ ان کی بے مثال حریت پسندی اور باطل کے سامنے سر نہ جھکانے کا جذبہ تھا۔ جوشؔ جس عہد میں سانس لے رہے تھے، انھیں اپنے گرد و نواح میں یزیدی قوتیں پوری طرح سرگرم نظر آ رہی تھیں اور ان کے جبر و ستم کا دائرہ مسلسل پھیل رہا تھا۔ جوشؔ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ان کٹھن حالات میں اگر کردارِ حسینؑ کی روشنی میسر نہ ہو، تو وقت کی یزیدیت کا مقابلہ کرنا اور اس کی یلغار کو روکنا ناممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں امام حسینؑ کو صرف ایک مذہبی شخصیت کے بجائے اعلیٰ انسانی اوصاف کے حامل ایک ایسے عالمگیر کردار کے روپ میں پیش کرتے ہیں جو پوری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی 'حسینؑ دوستی' محض ایک روایتی عقیدت نہیں بلکہ ان کی روح کی گہرائیوں میں رچا بسا ایک ایسا پختہ احساس ہے جسے انھوں نے زمانے کے کسی بھی تغیر یا زوال کی نذر ہونے نہیں دیا۔ ان کی شخصیت میں

فکری تلاطم کا یہ عالم ہے کہ وہ تصورِ الٰہی کے معاملے میں کبھی شاخِ نازک کی طرح لچکتے ہیں اور کبھی کوہِ گراں کی طرح اٹل نظر آتے ہیں۔ خدائے قادر و مطلق کے حوالے سے ان کا رویہ کبھی والہانہ تسلیم و رضا کا رہا ہے تو کبھی وہ ایک بیباک مفکر کی طرح 'خدا' سے روٹھتے اور بحث کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ معرفتِ الٰہی کے باب میں ان کا وجدان کبھی ایسی بلندیوں کو چھوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق
کے لیے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح
کافی تھی

جوشؔ کی شخصیت میں فکری انارکی کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی ان کا فلسفہ عقل و خرد تصورِ خدا سے متصادم ہوتا ہے، تو وہ نہایت بیباکی سے 'انکار' کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں۔ لیکن اس فکری تلاطم کے باوجود، 'حسینؑ اور عشقِ حسینؑ' وہ واحد مرکزِ ثقل ہے جہاں جوشؔ کی طبیعت کا تلون آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ عشقِ حسینؑ کی راہ میں وہ دنیوی جاہ و جلال کو تو ہیچ سمجھتے ہی ہیں، بلکہ کوثر و تسنیم اور جنت جیسی رعنائیوں کو بھی ٹھکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ واحد مقام ہے جہاں جوشؔ جیسا سیماب صفت اور متلون مزاج شاعر اپنے تمام فکری ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ یہاں آ کر ان کی لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی طبیعت دم توڑ دیتی ہے اور وہ ایک ایسے عقیدت مند نظر آتے ہیں جس کا تذبذب، یقینِ کامل میں بدل چکا ہو۔

وہ جوشؔ جو ہر شے کو عقل کی میزان میں تولنے کے عادی ہیں اور اسی عقلیت پسندی کے جوش میں کبھی سقراطؑ اور رسولِ اکرم ﷺ کے تقابل سے بھی نہیں چوکتے، وہی جوشؔ جب حسینؑ کے آستانے پر پہنچتے ہیں تو عقلِ مصلحت بیں کے بجائے 'عشقِ بے خطر' کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ حسینؑ ان کی روح میں عقل بن کر نہیں بلکہ ایک وجدانی عشق بن کر سرایت کر گئے ہیں۔ اگرچہ

اس کیفیت کا احساس خود جوشؔ کو بھی ہے، مگر ان کی انا شاید اس کا برملا اعتراف کرنے سے کتراتی رہی ہے۔ امام حسینؑ کے عالمگیر کردار کے حوالے سے جوشؔ کا یہ منفرد نظریہ خود ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> "حسینؑ ناتواں تھے ، یزید توانا تھا، قانونِ قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہیے تھا کہ یزید، حسینؑ کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گُل کردیتا ۔ لیکن ہوا یہ کہ ، قانونِ قدرت کے علی الرغم ، حسینؑ کی ناتوانی نے یزید کی توانائی کا گلہ گھونٹ کر رکھ دیا ، اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں ۔وہ موت منہ کھولے جب حسینؑ کے سامنے آئی تو حسینؑ اس کو دیکھ کر ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں "(۱۶)

جوشؔ کے یہ تمام نظریات درحقیقت ان کے عشقِ حسینؑ کا ثمر ہیں، جس کی بنیاد پر وہ رسولِ خدا ﷺ، مولا علیؑ اور امامِ عالی مقامؑ سے اپنی والہانہ وابستگی اور قلبی جذبات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم، امام حسینؑ سے اپنی اس گہری نسبت کی وضاحت میں وہ محض جذبات پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی عقل پسندی اور منطقی سوچ کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امام حسینؑ سے ان کا رشتہ صرف کسی مذہبی عقیدے یا دینی وابستگی تک محدود نہیں، بلکہ یہ رابطہ بلند انسانی اقدار اور اخلاقی اوصاف پر قائم ہے۔ یہی وہ عالمی اور انسانی نقطہ نظر ہے جس کی بنا پر وہ سقراطؔ، زرتشتؔ، گوتم بدھؔ، تلسی داسؔ، کنفیوشسؔ، حضرت عیسیٰؑ، کبیر داسؔ، گرو نانکؔ، کارل مارکسؔ اور لیننؔ جیسی متنوع فکری و تاریخی شخصیات کے بھی معترف نظر آتے

ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جوشؔ جہاں ایک طرف امام حسینؑ کی بارگاہ میں اپنی والہانہ عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں، وہیں اپنی عقل پرستی کے زیرِ اثر وہ امام کی ذات کو محض ایک روایتی مذہبی پیشوا کے طور پر دیکھنے کے بجائے ایک "انسانِ کامل" کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام حسینؑ کا وجودِ مسعود ان تمام اعلیٰ بشری صلاحیتوں اور پاکیزہ کردار کا بہترین نمونہ ہے جن کی تمنا ایک باشعور انسانیت کر سکتی ہے

جوشؔ کی ذہنی اور فنی تربیت میں لکھنؤ کی علمی و ادبی فضا کا کلیدی کردار ہے۔ مگر اس کے علاوہ ان کی مرثیہ نگاری کے محرکات کے حوالے سے ایک اہم واقعے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جوشؔ ملیح آبادیؔ جیسے رنگین خیال شاعر مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ کیسے ہوئے اور کس شدت اور احساس کے ساتھ متوجہ ہوئے کہ اُردو مرثیہ کو نئے انداز میں پیش کرکے اس صنفِ سخن سے بیداری اور سامراج کے خلاف ٹکرانے کا جذبہ اور ہمت پیدا کرنے کا کام لیا۔اپنی مرثیہ گوئی کے محرک کے حوالے سے جوشؔ صاحب فرماتے ہیں ؛

> "ایک دن ایک بہت بڑے انگریز آفیسر نے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں اور جو بہت بڑے عہدے پر فائز تھا عربی اور فارسی بھی جانتا تھا مجھ سے کہا کہ جوشؔ صاحب آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے،میں نے کہا، جی ہاں۔۔۔ کہنے لگا۔آپ محرم سے واقف ہیں؟ میں نے اس سے کہا صاحب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟کہنے لگا ہاں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حسینؑ کی شہادت سے کیا فائدہ اٹھایا ؟ آپ صرف آنسو بہاتےہیں، جوشؔ صاحب! اگر صرف مٹھی بھر مسلمان حسینؑ کی

اسپرٹ کو سمجھ لیں تو برٹش ایمپائر تین مہینے میں
ختم ہوجائے،یہی وجہ ہے کہ میں ایک نئے
جذبے کے ساتھ مرثیے کے میدان میں آیا۔" (۱۷)

جوشؔ ملیح آبادیؔ کی مرثیہ گوئی کے محرکات میں ان کا خاندانی پس منظر اور ماحول کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں ۔ جوشؔ کے پر دادا اُردو کے مایہ ناز شاعر فقیر محمد خان گویاؔ کابل سے ہجرت کرکے بادشاہ اودھ کے وزیر مقرر ہوکر ملیح آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ ملیح آباد میں شاعری اور مرثیہ گوئی کی بنیاد نواب گویاؔ ہی نے رکھی۔وہ ناسخؔ کے شاگرد تھے ۔ "دیوانِ گویا" جو ۱۸۳۱ء میں شائع ہوا اس میں غزلیات کے ساتھ ساتھ ایک مرثیہ بھی شامل ہے ۔اس سے پتا چلتاہے کہ جوشؔ کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے خاندان میں مرثیہ گوئی کا رواج قائم ہوگیا تھا ۔ جوشؔ کا پورا خاندان فرقے کے اعتبار سے سنی مسلمان تھا ۔ جوشؔ کے دادا نواب محمد احمدؔ خان کی شادی ایرانی النسل خاتون سے ہوئی تو ان کے خاندان میں پہلی بار عزاداری کی روایت قائم ہوئی ۔ جوشؔ کے والد بشیرؔ احمد خان بڑے علم دوست اور ادب نواز شخصیت تھے اس لیے اس دور کے نامور شعرا، امیرؔ مینائی ، جلیلؔ مانک پوری، عزیزؔ لکھنوی، اور آرزوؔ لکھنوی جیسے بڑے شعرااان کے گھر پر ہفتوں تک قیام کرتے اور شعر و شاعری کا سماں بندھ جاتا تھا۔ جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کے محرکات محض اتفاقی نہیں بلکہ ان کی جڑیں خاندانی پس منظر اور لکھنوی تہذیب میں پیوست ہیں۔ جوشؔ نے اپنی خود نوشت "یادوں کی برات" میں اپنی والدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" :میری ماں کو شاعری سے گہرا شغف اور میر انیسؔ سے والہانہ عقیدت تھی؛ وہ انیسؔ کے مراثی پڑھ کر اور سن کر اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتی تھیں۔ "ماں کی اس رقتِ قلبی اور شعری ذوق نے جوشؔ کے لاشعور میں انیسیت کا بیج بو دیا تھا۔

جوشؔ کی مرثیہ نگاری کے ادوار

جوشؔ ملیح آبادی کے رثائی سفر کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ان کی پہلی نظم **"ہلالِ محرم"** سے ہوتا ہے، جبکہ اس سلسلے کی آخری کڑی ان کا تشنۂ تکمیل مرثیہ **"وفاداری "** ہے، جس کی تخلیق کا عمل ۱۹۶۷ء تک جاری رہا۔ اس لحاظ سے جوشؔ کی رثائی شاعری کا سفر تقریباً نصف صدی سے زائد، یعنی باسٹھ (۶۲) برسوں پر محیط ہے۔ جوشؔ کے اس طویل فنی سفر، اسلوب کے تنوع اور فکری ارتقاء کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے ناقدین نے ان کی رثائی شاعری کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ یہ ادوار نہ صرف جوشؔ کے شخصی ارتقاء کے آئینہ دار ہیں، بلکہ ان سے جدید مرثیے کی بتدریج تشکیل اور اس کے فنی سنگِ میل کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

پہلا دور، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۳ء تک

دس برسوں پر محیط جوشؔ کی مرثیہ نگاری کا یہ دور ان کی پہلی نظم "ہلالِ محرم " سے لے کر ملیح آباد میں قیام کے آخری سال ۱۹۲۳ء تک ہے ۔جوشؔ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں ملیح آباد سے حیدر آباد دکن چلے گئے تھے ۔اس دور میں جوشؔ نے دیگر موضوعات پر شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کے حوالے سے بھی متعدد نظمیں کہیں ۔ ان کا مجموعہ " شعلہ و شبنم " کی بہت سی نظمیں اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں ۔دیگر نظموں کے علاوہ رثائی ادب میں اس دور کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلاسیکل طرز پر باقاعدہ مرثیہ " آوازۂ حق" ہے ۔

جوشؔ نے اپنی نو عمری میں مختلف نوعیت کی نظموں کے ساتھ ساتھ بہت سی رثائی نظمیں بھی کہی تھیں جو کہ خود جوشؔ کے بقول محفوظ نہ رہ سکیں ۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ملیح آباد میں مختلف نظموں کے علاوہ انھوں نے ایسے قطعات اور بعض منتشر اشعار بھی کہیں تھے جن میں کسی نہ کسی زاویے سے واقعۂکربلا پر روشنی ڈالی گئی تھی لیکن بقول جوشؔ کے یہ

سرسری اور غیر اہم ہونے کی وجہ سے انھیں لکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔

جوشؔ ملیح آبادی کا پہلا شعری مجموعہ "روحِ ادب" ۱۹۲۰ء میں منظرِ عام پر آیا، جس میں فلسفیانہ گہرائی اور رثائی ادب کے رنگ میں رنگی ہوئی متعدد نظمیں شامل تھیں۔ ان میں چودہ اشعار پر مشتمل ایک فکر انگیز نظم "نفسِ مطمئنہ" بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے مولائے کائنات حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے مابین ایک بصیرت افروز مکالمے کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح سات بندوں پر محیط ایک اور نظم "دنیا" کے عنوان سے موجود ہے، جو دنیاوی آلائشوں سے بیزاری اور اخلاقی و روحانی اقدار کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ جوشؔ نے اس دور میں عزم و ہمت اور جہدِ مسلسل پر مبنی بہت سا کلام تخلیق کیا، تاہم اس کا بڑا حصہ وقت کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔

اس ابتدائی دور کا سب سے اہم کارنامہ ان کا مرثیہ "آوازۂ حق" ہے، جو دسمبر ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ایک رسالے یا کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔ اگرچہ یہ اصل کتابچہ اب نایاب ہو چکا ہے، لیکن بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں اسے جوشؔ کے مشہور مجموعے "شعلہ و شبنم" میں شامل کیا گیا۔ "آوازۂ حق" درحقیقت ایک جدید نظم ہے جس میں روایتی مرثیے کے انداز میں واقعاتِ کربلا اور شہادتِ امام حسینؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کا اسلوب اگرچہ کلاسیکی مرثیے سے ہم آہنگ ہے، تاہم اس کی انفرادیت یہ ہے کہ جوشؔ نے آخری چند بندوں میں سانحۂ کربلا کو اپنے عہد کے پُرآشوب حالات سے جوڑ کر اس سے ایک توانا اخلاقی اور اصلاحی پہلو نکالا ہے۔ جوشؔ کی رثائی شاعری کے مطالعے میں اس دور کی بعض دیگر نظمیں بھی کلیدی اہمیت رکھتی ہیں، جن میں 'اے خدا'، 'شمعِ ہدایت'، 'متوالیانِ وقف حسین آباد سے خطاب'، 'آنسو اور تلوار' اور 'سوگوارانِ حسین سے خطاب' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرا دور، ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک

جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کا دوسرا دور بھی تقریباً ایک دہائی پر مشتمل ہے، جو ان کے قیامِ حیدرآباد (دکن) کے دورانیے کا احاطہ کرتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں جوشؔ نے کوئی باقاعدہ 'مرثیہ' تخلیق نہیں کیا، تاہم رثائی فضا سے ان کا ذہنی اور فکری رشتہ اس قدر استوار رہا کہ اس کے زیرِ اثر انھوں نے ایسی نظمیں کہی جن کا تعلق بالواسطہ طور پر رثائی ادب اور مرثیے ہی سے بنتا ہے۔

اس عہد میں جوشؔ نے میلادِ نبوی ﷺ کے موضوع پر دو اہم نظمیں **"ولادتِ رسولؐ "**اور **"کافرِ نعمت مسلماں "**تحریر کیں، جن میں ملی اصلاح کا رنگ نہایت نمایاں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی پر جوشؔ نے اس دور میں جو خامہ فرسائی کی، وہ روایتی نعت گوئی کی سطح سے کہیں بلند اور فکری آفاق سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی ۶۸ اشعار پر مشتمل نظم **"پیغمبرِ اسلامؐ "**تو ایک وجدانی کیفیت کا مرقع ہے، جس کے رگ و پے میں اول تا آخر ایک منقبتی آہنگ کی لہر رواں دواں محسوس ہوتی ہے۔ جوشؔ کی اس دور کی شاعری کی معنویت پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسینؔ رقم طراز ہیں کہ:

> "گو رسمی مذہب سے جوشؔ ہٹتے جارہے تھے لیکن اسلام کی بعض مقتدر ہستیوں کی زندگی کے وہ رخ جو ان کے نقطۂنظر کے واضح کرنے میں معین تھے انھیں وہ خاص طور سے پیش کررہے تھے۔"(۱۸)

اس زمانے میں انھوں نے جو جو نظمیں لکھیں ان میں اثر انگیزی کے اعتبار سے :"ذاکر سے خطاب" سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور یہ نظم ان کی شعری سفر میں بڑے موڑ کا درجہ رکھتی ہے ۔اس نظم کے ذریعے جوشؔ نے پہلی بار اُردو مرثیہ گو شعرا کی فکری یکسانیت سے

انحراف کرتے ہوئے امام حسینؑ کے کردار کو ایک نئے انداز اور زاویے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہنس کے جس نے پی لیا جامِ مرگیا لیکن نہ کی
شہادت وہ حسینؑ فاسق کی بیعت وہ حسینؑ
ہے رسالت کی سپر جس کی جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی
امامت وہ حسینؑ عزت وہ حسینؑ

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال
کر
مسکرایاموت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

جوشؔ نے اس نظم کے فکری تانے بانے تحریکِ آزادی کے ساتھ جوڑتے ہوئے 'ذاکر' کو نہایت شدت سے اس بات پر جھنجھوڑا ہے کہ وہ باطل کے خلاف منبرِ حسینؑ سے صدائے احتجاج بلند کیوں نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک حقیقی حسینی وہی ہے جو ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو، اور اسی عمل کو وہ اتباعِ حسینؑ کے لیے ایک بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کا ایقان تھا کہ قوم و ملت کی فکری رہنمائی اور فلاح کی باگ ڈور منبر کے ہاتھ میں بھی ہے، اس لیے اسے محض روایتی بیان تک محدود رہنے کے بجائے انقلابی کردار ادا کرنا چاہیے۔

آہ تو اور سازِ برگِ کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی
عافیت کا اہتمام حکومت ہے حرام
تجھ کو اور زنداں کا ڈر کیوں اے! غلامِ جانتا ہے ؟ رہ چکے ہیں
ننگ ونام قید میں کتنے امام؟

تو مثالِ اہل بیتِ پاکؑ مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کرسکتا نہیں(۱۹)

تیسرا دور، ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۵ء تک

جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کا یہ اہم ترین زمانہ ۱۹۳۵ء میں ان کے دہلی میں قیام سے شروع ہو کر ۱۹۵۵ء تک یعنی ہندوستان میں ان کے قیام کے آخری برسوں پر محیط ہے، جو تقریباً دو دہائیوں کا عرصہ بنتا ہے۔ اس دور کو بلاشبہ ان کی ادبی زندگی کا 'عہدِ زریں' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان منتقل ہونے سے قبل، اسی عرصے میں انھوں نے رسالہ "کلیم" کا اجرا کیا اور مؤقر جریدے "آج کل" کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں جوشؔ کی خلاقانہ صلاحیتیں عروج پر تھیں اور ان کی شاعری کے بارہ مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ اس عہد کی ایک اور بڑی خصوصیت ان کی طویل ترین نظم "حرفِ آخر" کا آغاز ہے، جس کا موضوعاتی کینوس آغازِ کائنات سے لے کر ہنگامہ محشر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس شاہکار نظم کا ابتدائی حصہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں ان کے شعری مجموعے "رامش و رنگ" کی زینت بنا، جبکہ اس کا بیشتر حصہ تاحال اشاعت کا منتظر ہے۔

جوشؔ کی مرثیہ نگاری کے اس تیسرے دور میں ان کے فکری و ذہنی رجحانات کے متنوع زاویے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اس دور کا سب سے نمایاں فکری رخ یہ ہے کہ جوشؔ نے تصورِ خدا، مذہب، فلسفہِ حیات اور کائنات کی تفہیم کے لیے عقل و دانش کو ہی واحد میزان اور مقدم قرار دیا ہے۔ ان کے فکری ارتقاء کا دوسرا اہم پہلو ان کی شاعری میں پایا جانے والا وہ پرشور سیاسی آہنگ ہے جس نے حریت اور انقلاب کے جذبے کو ایک نئی گونج عطا کی ہے۔ جوشؔ کے اس عہد کی سب سے وقیع اور شاہکار تخلیق، جو ان کے ان تمام فکری و سیاسی رجحانات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، ان کا شہرہ آفاق مرثیہ **"حسینؑ اور انقلاب"** ہے۔ یہ مرثیہ جس دور میں تخلیق ہوا، وہ عالمی سطح پر دوسری جنگِ عظیم کے مہیب سیاسی و سماجی اثرات کی لپیٹ میں تھا، جبکہ مقامی طور پر برصغیر کی تحریکِ آزادی ایک ایسے فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں

استعماری قوت پر آخری کاری ضرب لگانا ناگزیر ہو چکا تھا۔ ان دگرگوں حالات میں مسلمانوں کے اندر حریت کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے جوشؔ کا یہ مرثیہ ایک کلیدی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسینؑ اور انقلاب" ایک ایسی شاہکار تخلیق ثابت ہوئی جس کے منظرِ عام پر آتے ہی اردو مرثیہ نگاری کے فن پر نئے زاویوں سے تنقیدی بحث کا آغاز ہوا، جس میں اختلاف اور اعتراف کے دونوں پہلو نمایاں تھے۔ برطانوی سامراج کے طویل عہدِ محکومی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس مرثیے کا شدید سیاسی اور مزاحمتی لب و لہجہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس وقت وقت کی ضرورت تھی کہ واقعۂ کربلا کو عصری تناظر میں دیکھا جائے؛ چنانچہ اس شاہکار کے ذریعے جوشؔ کے کلام میں ایک نئی توانائی پیدا ہوئی، جس کی بدولت انھوں نے کربلا کے واقعے کو آفاقی معنویت عطا کی۔ دوسری طرف، اس پر یہ اعتراض بھی اٹھایا گیا کہ اس میں روایتی مرثیے کی 'دلگدازی' اور 'رقت' مفقود ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس میں گریہ و زاری کا وہ مخصوص رنگ غالب نہیں، لیکن جہاں کہیں بھی غم کی لہر ابھری ہے، اس کی کاٹ اور اثر انگیزی نہایت گہری ہے۔ مختصر یہ کہ جوشؔ کی مرثیہ نگاری کا یہ تیسرا دور نہایت اہمیت کا حامل ہے، جس میں انھوں نے "حسینؑ اور انقلاب" کے علاوہ متعدد مختصر و طویل نظمیں، سلام اور یادگار رثائی رباعیات تخلیق کیں۔ ان کی ایک رباعی، جو انھوں نے منبر سے اپنا یہ معرکہ آرا مرثیہ سنانے سے قبل پڑھی تھی، اپنی عالمگیر شہرت اور بے پناہ تاثیر کی وجہ سے آج بھی زبان زدِ عام ہے:

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ
چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ(۲۰)

چوتھا دور، ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء تک

جوشؔ کی مرثیہ نگاری کا اختتامی مرحلہ جوش کی ۱۹۵۶ء میں پاکستان ہجرت سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ گیارہ سالہ دور صنفِ مرثیہ کے حوالے سے ان کے فکری و فنی ارتقاء کا نقطہ عروج کہلایا جا سکتا ہے۔ پاکستان آمد سے قبل جوشؔ کے ضخیم شعری اثاثے میں صرف دو مرثیے، 'آوازۂ حق' اور 'حسینؑ اور انقلاب' شامل تھے، لیکن ہجرت کے بعد انھوں نے اپنی پوری تخلیقی توانائی اس صنف کے لیے وقف کر دی۔ اس مختصر عرصے میں انھوں نے متعدد منقبتی و رثائی نظموں اور سلاموں کے علاوہ سات شاہکار اور مکمل مرثیے تخلیق کیے، جن میں'وحدتِ انسانی'، 'موجد و مفکر'، 'عظمتِ انسان'، 'خاک'، 'موت محمد و آلِ محمدؐ کی نظر میں'، 'آگ' اور 'پانی' جیسے یادگار عنوانات شامل ہیں۔ پاکستان میں قیام کے دوران جوشؔ نے اپنے کمالِ فن اور فنی مہارت سے مرثیے کو نئی بلندیوں اور 'اوجِ کمال' سے روشناس کرایا، جس کے نتیجے میں اردو ادب کو ایسے لافانی شاہکار میسر آئے جو ان کے ارتقائی سفر کی بہترین علامت ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کے فنی سفر کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ ان کی تخلیقی جبلت کا یہ خاصہ ہے کہ جو جذبہ ان کے باطن کی اتھاہ گہرائیوں میں سرایت کر گیا، اسے انھوں نے پوری دیانتداری اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ قرطاسِ ابیض پر منتقل کر دیا۔ جوشؔ کا تخلیقی چشمہ محض روایتی خیالات سے نہیں پھوٹتا، بلکہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ انقلابی امنگوں، حریت کے ولولوں اور سماجی تبدیلیوں کے سائے میں پروان چڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ اپنے عہد کے فکری ہیجان اور انسانی آزادی کی تڑپ کا ایک زندہ بیانیہ ہے۔چونکہ جوشؔ کا معرکہ آراء مرثیہ "حسینؑ اور انقلاب" قیامِ پاکستان سے چھ برس قبل تخلیق ہوا

تھا، اس لیے اس کی پوری عمارت آزادی کی تڑپ اور انقلابی ولولے پر استوار تھی۔ تاہم، جب ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے مسلمانوں کو برطانوی سامراج سے نجات ملی اور تحریکِ آزادی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی، تو بدلے ہوئے حالات میں 'انقلاب' کے سماجی و سیاسی مفاہیم بھی تبدیل ہو گئے۔ اسی تناظر میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کا معیار اور پیمانہ بھی یکسر بدل گیا، جو کہ ایک فطری ارتقائی عمل تھا۔ "حسینؑ اور انقلاب" میں حکمران طبقے اور استعماری قوتوں کے خلاف جو گھن گرج اور للکار موجود تھی، اس کے برعکس ہجرت کے بعد لکھے گئے مرثیوں میں جوشؔ کا رخ براہِ راست عوام کی جانب ہو گیا۔ اب انھوں نے معاشرے میں سرایت کر جانے والی بے حسی اور بے روح زندگی کو اپنا ہدف بنایا اور سماجی ناانصافیوں و بربریت کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنے والوں پر کڑی تنقید کی۔ ان کا یہ شعر (بیت) اسی بدلے ہوئے فکری رویے کی عکاسی کرتا ہے:

تخت پر سرمایہ داری ہے بصد اجلال و زین
اور ٹس سے مس نہیں ہوتے محبانِ حسینؑ

پاکستان میں ۱۹۵۶ء کے بعد جوشؔ کی مرثیہ نگاری اور منقبتی شاعری کا جو نیا باب کھلا، اس میں جذباتی محرکات کے بجائے فکری اور فلسفیانہ عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس دور کے مراثی میں فکری میلان کے ساتھ ساتھ حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی حکیمانہ شخصیت کو محورِ فکر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جوشؔ کے اس بدلے ہوئے فکری اسلوب کی گواہی ان کی نظم "طلوعِ فکر" اور اسی زمانے میں 'ماہِ نو' میں شائع ہونے والی تخلیق "میں نعرۂ مستانہ" جیسی متعدد نظمیں دیتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا، قیامِ پاکستان کے بعد کے مراثی میں "حسینؑ اور انقلاب" جیسا سیاسی آہنگ اور انقلابی تلاطم تو موجود نہیں، مگر اس کی جگہ فکر و دانش کے نئے زاویے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ جب جوشؔ سے اس تبدیلی کی وجہ دریافت کی گئی، تو انھوں نے

نہایت پُرمعنز جواب دیا کہ اب ان کی نظر سیاسی پہلوؤں کے بجائے فکری مسائل کی گہرائیوں کی جانب مڑ چکی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے کربلا کے واقعات کی مفکرانہ تشریح کو نظموں کے قالب میں ڈھالنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس رجحان کے زیرِ اثر مرثیے میں بھی نظمیہ عناصر شامل ہونے لگے، جس کے نتیجے میں اس صنف کی روایتی رزمیہ ترتیب کسی حد تک متاثر ہوئی۔ انہی حالات میں جوشؔ ملیح آبادی مرثیے کے مستقبل کی ایک توانا آواز بن کر ابھرے۔ مرثیے میں نظمیہ اسلوب کے نفوذ اور اس صنف کے تمام فنی امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے جوشؔ کس حد تک وسعت پیدا کرنے میں کامیاب رہے، یہی وہ بنیادی معیار ہے جس کی روشنی میں ان کی مرثیہ نگاری کا محاکمہ کیا جا سکتا ہے۔

صنفِ مرثیہ میں مرزا اوجؔ کے فنی کمالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جوشؔ کو جدید مرثیے کا اولین موجد قرار دینا تو شاید ممکن نہ ہو، لیکن وہ بلاشبہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے اس صنف کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری اور بھرپور کوشش کی۔ جوشؔ کے مراثی اگرچہ 'مدس' کی کلاسیکی ہیئت ہی میں لکھے گئے ہیں، تاہم اپنی داخلی ساخت اور موضوعات کے اعتبار سے وہ قدیم مرثیے سے یکسر مختلف ہیں۔ چونکہ جوشؔ نے اپنے مراثی میں نظم کی تکنیک کو برتنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ناقدین کا ایک طبقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ ان تخلیقات پر مرثیے کی روایتی تعریف صادق نہیں آتی، لہٰذا انھیں 'مرثیہ' کہنے کے بجائے 'نظم' یا 'مدس' قرار دینا زیادہ قرینِ انصاف ہے۔

اگر ہم صنفِ مرثیہ کی بات کریں تو لفظ " مرثیہ " کے معنی دو جہات سے مکمل ہوتے ہیں ۔ اس کی ایک جہت یا پہلو اس کے موضوع

کے حوالے سے ہے ۔ یعنی امام حسینؑ اور اور شہدائے کربلا کے اوصاف و مصائب کا ذکر ۔جبکہ مرثیے کا دوسرا پہلو فنی نوعیت کا ہے، جس کا تعلق موضوعات کے اظہار اور مخصوص اسلوب سے ہے۔ کلاسیکی دور میں اس فنی امتیاز کا سختی سے خیال رکھا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے امام حسینؑ اور واقعۂ کربلا کے حوالے سے کہی گئی ہر نظم 'مرثیہ' نہیں کہلاتی، بلکہ ہیئت اور اندازِ بیان کے فرق سے ان منظومات کو نوحہ، سلام اور ماتم جیسے الگ الگ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس بنا پر موضوع کے ساتھ ساتھ اُردو مرثیہ کی ایک روایتی ترتیب بھی ہے۔جبکہ یہ روایتی ترتیب جوشؔ کے ہاں قدرے مجروح ہوگئی ہے ۔ مگر اس کی جگہ ایک ادھوری تنظیم بھی جوشؔ کے ان مدسات میں نظر آتی ہے جو دیگر اقسامِ نظم سے انھیں ممتاز کرتی ہے ۔ لہذا ان مدسوں میں موضوع کی عظمت اور جوشؔ کے خاص اہتمام کو دیکھتے ہوئے انھیں محض مدس کہنا مناسب نہیں بلکہ انھیں ان کی بڑی کوششوں میں شمار کرنا ہوگا۔

جوشؔ کے مرثیوں پر کیے جانے والے اعتراضات میں سب سے اہم نکتہ کلاسیکی ترتیب کی عدم موجودگی اور رثائیت (غم و الم) کی کمی ہے۔ اسی بنا پر بعض ناقدین ان کی تخلیقات کو سرے سے مرثیہ تسلیم کرنے کے بجائے محض 'مدس' قرار دیتے ہیں۔ تاہم، یہ ایک سطحی نقطہ نظر ہے جو مرثیے کی فنی وسعت اور اس کی بدلتی ہوئی جزئیات سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ کسی صنف کو صرف اس کی قدیم ہیئت یا روایتی اجزاء تک محدود کر دینا اس کے ارتقائی سفر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

جوشؔ ، ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کے نام ایک میں خط اپنے مرثیوں کے حوالے سے کیے جانے والے اعتراضات کے حوالے سے اپنا نقطۂنظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے
مدسوں کو مرثیے کہا جائے۔مجھے اس سے کوئی

> سروکار نہیں کہ انھیں آپ مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیشِ نظر اس قسم کے مدس لکھتے وقت مرثیے ہی کا تصور ہوتا ہے۔ میرا موضوع جب ان مرثیوں میں کربلا، حسینیت، عزمِ شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر نقادوں کی یہ رٹ کہ جوشؔ کے مدس جدید مرثیے نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"(۲۱)

جوشؔ کی مرثیہ نگاری کو سمجھنے کے لیے ان کے انقلابی افکار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہاں یہ سوال اہم ہے کہ کیا اصطلاحی طور پر وہ نظم 'مرثیہ' نہیں جس میں معرکہ کربلا اور شہدائے کربلا کا تذکرہ ہو؟ جوشؔ کے مراثی ہیئت اور مواد، دونوں اعتبار سے اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ جو ناقدین انھیں صرف 'مدس' قرار دیتے ہیں، وہ دراصل لکھنؤ کے کلاسیکی اجزائے ترکیبی (چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین) کو معیار بناتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے بھی کئی مراثی ان تمام اجزاء سے پاک ہیں؛ تو کیا انھیں صنفِ مرثیہ سے خارج سمجھا جائے گا؟ اگر کلاسیکی معیار کو بیسویں صدی کے مرثیے پر منطبق کیا جائے تو کوئی بھی جدید مرثیہ اس پر پورا نہیں اترے گا۔ ادب میں جمود نہیں ہوتا بلکہ یہ وقت کے ساتھ ارتقاء پذیر رہتا ہے۔ لہٰذا، موضوع اور ہیئت کی تبدیلی کو منفی سمجھنے کے بجائے اسے جدید مرثیے کے فطری ارتقاء کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔

جہاں تک جوشؔ ملیح آبادی کے افکار کا تعلق ہے، وہ بنیادی طور پر ایک نظریاتی شاعر ہیں، چنانچہ ان کی مرثیہ نگاری بھی ان کے مخصوص فکری نظام کے تابع ہے۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا، مرثیے کے میدان میں جوشؔ کا ورود ایک خاص نظریے اور انقلابی جذبے کے تحت ہوا تھا۔ اس صنف میں ان کا سب سے اہم اور انقلابی قدم مرثیے کے روایتی

'مقصد' کو تبدیل کرنا تھا۔ انھوں نے مرثیے کی فنی ترتیب اور اس کے موضوعات، دونوں کو بیسویں صدی کے سیاسی شعور اور فکری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ جوشؔ نے مرثیے کو محض گریہ و زاری کے حصار سے نکال کر اسے تحریک اور عمل کا ذریعہ بنایا، اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ جوشؔ کے تخلیق کردہ یہ نمونے اپنے جوہر اور اصل معنوں میں 'مرثیے' ہی کے منصب پر فائز ہیں۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے اُردو ادب کا سرمایۂ افتخار ہیں ۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں واقعۂ کربلا کے ان گوشوں کو اجاگر کیا ہیں جن کو عموماً مرثیہ گو نظرانداز کرجاتے ہیں ۔ جوشؔ نے اپنے مراثی کے ذریعے ثابت کیا کہ مرثیہ محض آہ و بکا کا مجموعہ نہیں، بلکہ انسانیت کے لیے ہدایت کا وہ چراغ ہے جو ظلمت کو ختم کر کے جرأت اور عزم و حوصلے کی روشنی پھیلاتا ہے۔ وہ اردو شاعری کے پہلے فنکار ہیں جنھوں نے 'جدید مرثیہ' کی بنیاد رکھ کر اس صنف کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، جب تحریکِ آزادی عروج پر تھی، جوشؔ نے اپنا پہلا مرثیہ **"آوازۂ حق "** تخلیق کیا۔انھوں نے سامراج دشمنی کے لیے شاعری کو ایک مؤثر ہتھیار بنایا اور آزادی کی جدوجہد کو 'تازہ کربلا' کا نام دے کر کربلائی کرداروں کو بطورِ آئیڈیل پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بین (غم) کے مقابلے میں رزم (جوش) کا عنصر نمایاں ہے اور وہ امام حسینؑ کی سیرت کے بیان میں گریہ کے بجائے شجاعت، صبر اور استقلال پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ، روایتی اندازِ تخاطب کے برعکس وہ پیروکارانِ حسینؑ سے کچھ اس منفرد انداز میں مخاطب ہوتے ہیں:

اور بالخصوص جب ہو رعب و شکوہ و جاہ و
حکومت کا سامنا جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی قرنا و طبل و ناوک و
ہیبت کا سامنا رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد
ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ
مرد ہے(۲۲)

دوسری جنگِ عظیم کے مہیب سائے میں جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ فیصلہ کن مرحلے کی جانب گامزن تھی، عین اسی وقت جوشؔ نے اپنا دوسرا معرکہ آرا مرثیہ "حسینؑ اور انقلاب" تخلیق کر کے بیسویں صدی کے قارئین اور سامعین کے سامنے معرکہ کربلا اور ذاتِ حسینؑ کی ایک اچھوتی تعبیر پیش کی۔ اس شاہکار کے ذریعے جوشؔ نے مرثیہ نگاری کے جدید رجحانات سے ہر خاص و عام کو متعارف کرایا۔ انھوں نے نئے فکری موضوعات اور عصرِ حاضر کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس صنف کو ایک اچھوتے رنگ اور ولولہ انگیز آہنگ سے روشناس کیا۔ جوشؔ اپنی مرثیہ گوئی کے بنیادی اصولوں اور فنی ضوابط کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اور پھر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کرکے مومنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو اگر تم حسینی ہو تو خبردار باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور فرمانروایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا۔"(۲۳)

جوشؔ کا یہ پیغام اور یہ ،مزاج ان کے تقریباً ہر مرثیے میں نظر آتا ہے :

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ کربلا خرمنِ سرمایہ پہ

دوراں ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ کربلا جرأت انکار ہے
آوازِ اذاں پیشِ دوراں

فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی(۲۴)

جوشؔ نے اپنے پہلے مرثیے " آوازۂ حق" میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہوئے مرثیے کے تمام تر رسمی لوازم کو برقرار رکھا ہے ،اور چہرہ ، رخصت ، آمد، شہادت اور بین سمیت کلاسیکل مرثیہ کے تمام اجزا کا خاص خیال رکھا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں جدت کا عنصر پیدا کرتے ہوئے آخر میں قومی خیالات کا پیوند لگایا ہے اپنی اس پہلی کوشش میں تمام تر اصولوں کا خیال رکھنے کے باوجود جوشؔ نے بعد کے تمام مرثیوں میں عام طور پر کردار نگاری کی طرف توجہ نہیں دی ہے ۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں کربلا کے افراد کو کردار سے زیادہ علامت کا روپ دینے کی کوشش کی ہے اور انھیں سیاسی اور تاریخی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ کردار نگاری کی جھلک وہاں نظر آتی ہے جہاں جوشؔ اپنے اظہار کو ایک ڈرامائی تاثر میں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ بند ملاحظہ فرمائیں:

یوں بجھا کر رکھ دیے آہوں نے آنسوؤں میں بہہ گئے طبل و
ذلت کے دیے علم کے دبدبے
بیڑیوں کی گونج سے ایوان ایک بی بیؑ کی خطابت نے وہ
تھّرانے لگے ڈھائے زلزلے

اشکِ خوں روشن ہوئے نظروں سے تارے گر
گئے
خاک پہ قصرِ حکومت کے
منارے گر گئے(۲۵)

یعنی ہم کہ سکتے ہیں کہ محدود پیمانے پر ہی سہی مگر جوشؔ کے ہاں موثر

کردار نگاری ملتی ہے۔

اپنے اولین مرثیے "آوازۂ حق" کے علاوہ، جوشؔ نے اپنے تمام مابعد مراثی میں نہ صرف روایتی فنی ترتیب کو بدلا بلکہ مرثیے کے کلاسیکی بیانیہ اسلوب سے بھی انحراف کیا۔ جوشؔ کے ہاں مرثیہ محض واقعات کی پیش کش (بیانیہ) تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کا انداز 'مبصرانہ' اور مفکرانہ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ مبصرانہ انداز صنفِ "سلام" کے لیے زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے، مگر جوشؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے سلام کی اسی تکنیک کو طویل نظم کے فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرثیے کے وسیع کینوس پر کامیابی سے برتا ہے۔

اگر ہم تاریخی اعتبار سے جائزہ لیں تو جوشؔ کے ابتدائی دو مرثیے، یعنی "آوازۂ حق" (۱۹۲۰ء) اور "حسینؑ اور انقلاب" (۱۹۴۱ء) قیامِ پاکستان سے قبل کی تخلیقات ہیں۔ ان میں بالترتیب شہادت کے فلسفے اور قومی آزادی کے ولولے جیسے موضوعات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس، آزادی کے بعد تخلیق کیے گئے جوشؔ کے تمام مراثی میں ایک عمومی موضوع کے ساتھ ساتھ متعدد ذیلی موضوعات اور فکری پہلو بھی شامل ہو گئے ہیں، جو ان کے فن کی وسعت اور فکری ارتقاء کا ثبوت ہیں۔جوشؔ نے اپنے ان مرثیوں میں ضمنی موضوعات کا انتخاب اس طریقے سے کیا ہے کہ ان میں آفاقی مسائل سما سکیں اور اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ جوشؔ کو ذیلی مضامین کو تراشنے کا ملکہ حاصل ہے ۔لیکن ان کے مرثیوں میں بعض جگہوں میں یہی ذیلی موضوعات کا التزام بے اعتدالی کا سبب بنا ہے جوشؔ اپنے مرثیے **"موت محمدؐ و آلِ محمدؐ کی نظر میں "**میں زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے کلام کے آہنگ کو روایتی رثائیت کے مزاج سے اس قدر دور لے گئے ہیں کہ قاری حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس مرثیے میں موت کو ایک المناک انجام کے بجائے جلال و جمال اور ایک نئی زندگی کے پرجوش آغاز کے طور پر پیش کیا ہے، جو مرثیہ نگاری

کے عمومی اسلوب سے یکسر مختلف اور اچھوتا ہے۔ اس منفرد طرزِ بیاں کی جھلک اس بند میں ملاحظہ فرمائیں:

ہر نفَس موتی پروتی پھول برساتی ہوئی خیمۂ زربفت میں پازیب چھنکاتی ہوئی
دوڑتی ، بڑھتی ، ہمکتی، جھومتی ، گاتی ہوئی مُرکیاں لیتی، ٹھمکتی ، ناچتی ، گاتی ہوئی
اک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی
ایک انگڑائی دھنک کے پُل پہ لہراتی ہوئی(۲۶)

اس مرثیے میں صرف ایک بند ہی نہیں، بلکہ مسلسل دس گیارہ بند ایسے ہیں جن کا بنیادی مقصد کائنات کی اشیاء کی بے ثباتی اور فنا پذیری کو آشکار کرنا ہے۔ تاہم، دنیا کی ناپائیداری کے بیان میں جوشؔ اس قدر تفصیل اور جزئیات نگاری میں چلے گئے ہیں کہ اگر اس مخصوص حصے کو مرثیے کے متن سے جدا کر دیا جائے، تو وہ بذاتِ خود ایک دلفریب اور مستقل شعری شاہکار کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مرثیے کے مجموعی تاثر اور تسلسل میں اس قدر طویل اور غیر ضروری تفصیل کی کوئی ناگزیر ضرورت محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ یہ طوالت بعض اوقات قاری کی توجہ کو اصل موضوع سے ہٹا دیتی ہے۔

جوشؔ اُردو مرثیہ کے مصلح بن کر اٹھے تھے ، ان سے توقع تھی کہ وہ مرثیہ کو جدید تحریک دینے کے ساتھ نیا اسلوب بھی عطا کریں گے لیکن جوشؔ نے مرثیہ نگاری کے باب میں بھی اپنے مجموعی سرمائہ کلام کا اسلوب ہی اختیار کرلیا ہے ۔ جوشؔ کے مرثیوں کا عمومی ڈھانچہ اپنے اسلوب میں صنفِ قصیدہ سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان کے ہاں تشبیب میں عمومی مضامین کا تنوع، قلب میں واقعۂ کربلا کی فکری تشریح اور مرثیے کے آخری حصے میں حالاتِ حاضرہ کا بیان ملتا ہے۔ یہی آخری

حصہ ان کے مرثیے کا سب سے نمایاں اور مستقل جزو ہے، جس میں وہ عصری مسائل کو کربلا کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے ممدوح سے عزم و استقلال اور فکری جلا کی دعا کرتے ہیں۔

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم خاک میں پھر مل چکا
کے سر پر قدم ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ڈونگے کھُل چکا ہے پھر دلِ انساں میں
پھر درم سونے کا علَم

پھر دفِ زر بج رہی ہے شور ہے اشرار کا
صف شکن! یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

اے قوم وہی پھر ہے تباہی اسلام ہے پھر تیرِ
کا زمانہ حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر تاریخ میں رہ جائے گا مردوں
چھیڑ ترانہ کا فسانہ

مٹتے ہوے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابنِ علیؑ ہو(۲۷)

جوشؔ کے مرثیے "آوازۂ حق" سے یہ امر سامنے آجاتا ہے کہ مرثیے کے قدیم سانچے اور جدید افکار کی ہم آہنگی فنی اعتبار سے ممکن ہے۔ جوشؔ اپنے اس مرثیے میں اپنے سیاسی افکار کو بھلے قالب میں نہ لاسکے ہوں مگر اپنے حکیمانہ آراء کو بہت ہی پُر تاثیر پیرایۂ اظہار دینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی تناظر میں زمانہ جوشؔ سے جس مخصوص آہنگ کا مطالبہ کر رہا تھا، وہ بلاشبہ 'رزمیہ' ہی تھا۔ تاہم، جوشؔ نے روایتی یا کلاسیکی مرثیے کے برعکس اپنے ہاں خارجی سطح پر ہونے والے جنگی مظاہر اور معرکہ آرائی کے روایتی مناظر کو تقریباً ختم کر دیا۔ مرثیے میں رزم نگاری کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جوشؔ نے مابعد الطبعی سطح پر

ایک نئی راہ نکالی۔ انھوں نے واقعۂ کربلا کے اس پہلو کو نہایت قوت سے اجاگر کیا کہ مادی طاقتیں بالآخر روحانی قوتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ اپنے اس نظریے کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے اپنا تمام تر زور اخلاقی برتری اور باطنی فتح کی عکاسی پر صرف کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے، بیانیہ تکنیک سے گریز کرتے ہوئے، انھوں نے اپنے مرکزی خیال کو مختلف استعاروں، متنوع تشبیہات اور بدلتے ہوئے پیرایوں میں پیش کیا۔ فنکارانہ سطح پر اس اسلوب کی خامی یہ رہی کہ اگرچہ خیال کو اظہار کا ایک حسین قالب تو میسر آ گیا، مگر بار بار کی تکرار نے مرثیے کے مجموعی تعمیری تسلسل کو کسی حد تک متاثر کیا:

جس کے ہر قطرے میں تھی قلزم کی طغیانی وہ خون — کاہ جس کی راہ میں تھا کوہِ سلطانی وہ خون
جس کے آگے خسروی کی آگ تھی پانی وہ خون — غرق ہو کر رہ گئی جس میں جہانبانی وہ خون
جس کی موجوں میں خمِ تیغ و مزاجِ سنگ تھا
نوحؑ کا طوفان جس کے دبدبے سے دنگ تھا(۲۸)

گوہرِ خوش آب نے شعلے کو پانی کر دیا — ضعف نے طاقت کو صیدِ ناتوانی کر دیا
فقر نے دولت کو محوِ نوحہ خوانی کر دیا — دین نے دنیا کو وقفِ سرگرانی کر دیا
صرف اک تنویر نے ظلمت کی خندق پاٹ دی
پنکھڑی کی دھار نے لوہے کی گردن کاٹ دی(۲۹)

جوشؔ شاعرِ انقلاب ہیں، تاہم بعض ناقدین ان کی اس انقلابی فکر کو تخریبی رجحانات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، ان کے مراثی کا

عمیق مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ان کی فکر کی مکمل تہذیب ہو چکی ہے اور ان کا نصب العین پہلے سے کہیں زیادہ واضح اور روشن ہو کر ابھرا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جوشؔ نے رزمیہ عنصر کو اہمیت دینے کے باوجود، واقعۂ کربلا کو محض ایک جنگ کے بجائے آفاقی اور فکری پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس تعمیری اور عالمگیر فکر کی بہترین مثال ان کے مرثیے **"وحدتِ انسانی "**میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

اے دوست! سعیِ امن سے ہو شاد و کا انسان کے دماغ
با مراد سرطان ہے عناد
روحِ بشر کی موت ہے اپنے غضب سے جنگ ہے
خونخواری و فساد سب سے بڑا جہاد
لاکھوں میں بے نظیر، کروڑوں میں فرد
ہے
جو مکرائے طیش میں بے شک وہ مرد
ہے(۳۰)

جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا، جوشؔ کے مراثی میں انقلابی آہنگ اور فکری عناصر کی فراوانی ہے۔ اسی بنیاد پر بعض ناقدین کا یہ اعتراض ہے کہ جوشؔ کے ہاں 'مبکی' عنصر (رقت و گریہ)، جو کہ مرثیے کے بنیادی لوازمات میں شمار ہوتا ہے، تقریباً مفقود ہے۔ تاہم، حقیقتِ حال یہ ہے کہ اگرچہ ان کے یہاں روایتی مصائب اور بین کا وہ مخصوص اسلوب اور اہتمام نظر نہیں آتا، لیکن انھوں نے اپنے مراثی میں ایسے لطیف اور گہرے تاثراتی اشارے پروئے ہیں جو قاری کے دل پر نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ جوشؔ کا فن یہ ہے کہ وہ روایتی آہ و بکا کے بغیر بھی ایسے رقت انگیز لمحات تخلیق کر لیتے ہیں جن سے آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی ہیں۔ اس حوالے سے چند نمایاں مثالیں درج ذیل ہیں:

وہ رات وہ فرات وہ موجوں عابدؑ کی کروٹوں پہ وہ بے

کا خلفشار چارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا اصغرؑ کا پیچ و تاب وہ جھولے
وقار میں بار بار
اصغرؑ میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب
کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآبؐ
کا(۳۱)

لبریز زہرِ جور سے وہ دُکھتے ہوئے وہ دل وہ تپکتے ہوئے
دشت کا ایاغ دماغ
آنکھوں کی پتلیوں سے عیاں وہ دلوں پُر ہول ظلمتوں میں وہ سہمے ہوئے
کے داغ چراغ
بکھرے ہوئے ہوا میں وہ گیسو رسولؐ کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتولؑ کے(۳۲)

جوشؔ نے اپنے مراثی میں شعوری طور پر اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ ان کی شاعری محض کسی بے کس اور مظلوم پر آنسو بہانے تک محدود نہ رہے۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز فنی حقیقت ہے کہ انھوں نے الفاظ کے چناؤ اور تراکیب کی ترتیب میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ جو قارئین یا سامعین الفاظ کی تہوں میں چھپے معانی اور ان کی کثیر الجہتی کو سمجھنے کا ملکہ رکھتے ہیں، ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی لہریں جذبات میں ایک ایسا ہیجان بیدار کرتی ہیں کہ آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی ہیں۔

جوشؔ کا فنِ ساحری یہ ہے کہ ان کے الفاظ متحرک ہو کر قاری کے تخیل میں خود بخود ذہنی تصاویر بناتے چلے جاتے ہیں۔ گویا وہ الفاظ کو محض لغوی معانی تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ انھیں جیتا جاگتا جذبہ اور گہرا احساس بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری پر وہی

رقت طاری ہو جاتی ہے جو روایتی یا کلاسیکی مرثیے کا 'بین' سنتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ایک جیتی جاگتی مثال اس بند میں دیکھی جا سکتی ہے:

رعبِ سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو　　بولتے رن میں نہ گھبراؤ تو لو
نامِ حسینؑ　　نامِ حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو　　موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ
نامِ حسینؑ　　تو لو نامِ حسینؑ
حلق سے تیغوں کا منہ موڑو تو لو نامِ حسینؑ
برگ سے فولاد کو توڑو تو لو نامِ حسینؑ (۳۳)

اردو شاعری کی تاریخ میں جوشؔ ملیح آبادی شاید وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی ذات کے بارے میں وہ حقائق بھی برملا تحریر کر دیے جنھیں بیان کرنے سے دوسرے ہچکچاتے ہیں۔ جوشؔ بنیادی طور پر ایک تلخ گو اور بے باک حقیقت پسند شاعر ہیں؛ وہ سچی بات کی کڑواہٹ سے کبھی خائف نہیں ہوتے اور جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر لاتے ہیں۔ انھیں منافقت اور منافقانہ طرزِ عمل سے شدید نفرت ہے اور ان کا یہ جارحانہ رویہ ان کی پوری شاعری میں ایک نمایاں رنگ کی طرح موجود ہے۔

یہ جذبہ ان کے مراثی میں مزید شدت اور توانائی کے ساتھ ابھرا ہے۔ جوشؔ کے نزدیک حضورِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد منافقانہ قوتوں نے اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کی مذموم کوششیں کیں، اور جب یہ فتنہ اپنی انتہا کو پہنچ کر دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے لگا، تو امام حسینؑ نے ان سازشوں کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کربلا کے میدان میں آپؑ کا ظہور ایک ایسے مجاہدِ حق کی صورت میں ہوا جس نے منافقت کے سر کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا۔ جوشؔ اپنے تقریباً تمام مراثی میں ان منافقین کے اصل چہروں سے نقاب الٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حق و باطل کے معرکے کو ایک نئے فکری تناظر میں پیش کرتے ہیں۔

اہلِ دل سے کہہ رہی ہے یہ بعد پیغمبرؐ ہوئی تھیں کس
،مورخ کی زباں طرح سرگوشیاں
چھاگیا تھا ہر طرف کس کیا دبے پاؤں چلے تھے سازشوں
طرح دولت کا دھواں کے کارواں

اب بھی ان امواج میں ڈوبی پڑی ہے کربلا
ہاں انھیں کی ایک تاریخی کڑی ہے کربلا(۳۴)

ایک اور بند کی بیت میں فرماتے ہیں :

کب نفاق اربابِ حق سے برسرِ پیکار
تھا
وہ خدا پر آخری لات و ہبل کا وار
تھا(۳۵)

جوشؔ کا اولین مرثیہ "آوازۂ حق" فنی اعتبار سے روایتی اور کلاسیکی مرثیہ نگاری کے قریب تر ہے، جس میں اس صنف کے تمام بنیادی اجزاء مثلاً چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ اس مرثیے کا اختتام اس عہد کی قومی زبوں حالی کے بیان اور بارگاہِ حسینؑ میں اس کا مداوا تلاش کرنے کی التجا پر ہوتا ہے۔ ان کا دوسرا معرکہ آرا مرثیہ "حسینؑ اور انقلاب" ہے، جس کا نمایاں وصف آزادی کی تڑپ اور حریت کی آرزو ہے۔ یہ دونوں شاہکار قیامِ پاکستان سے قبل تخلیق پائے۔

ان کے برعکس، جوشؔ کے بقیہ تمام مراثی ان کی ہجرت کے بعد کے دور کی پیداوار ہیں۔ ان متاخر مراثی میں جوشؔ نے روایتی رزم و بزم کے بجائے فکری گہرائی اور سماجی تنقید کو اپنا مرکزِ نگاہ بنایا ہے۔ جوشؔ کی اس تاریخی بصیرت اور گہرے سماجی شعور کے نتیجے میں اردو مرثیے میں سماجی تنقید کا ایک ایسا اچھوتا اور توانا اسلوب سامنے آیا ہے جو اس صنف کی تاریخ میں ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ بند ملاحظہ فرمائے:

کبریا! پروردگارا! کردگارا! داورا! کب سے میری قوم گہری نیند میں ہے مبتلا
کب سے پامالِ نفیرِ خواب ہے نیند آنکھوں کی اڑادے جوت میری صدا سینوں کی جگا
یا لگا دے سینۂ مومن میں باغ زندگی
یا بجھا دے اے خدا ! میرا چراغِ زندگی(۳۶)

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے مراثی میں شعوری طور پر خطابت کا رنگ اختیار کیا ہے، جس کی بدولت وہ شعریت اور معنویت کو ایک مخصوص بلند آہنگی کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تخیل کی پرواز ایک سیدھی لکیر کے بجائے دائروں کی صورت میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی مرکزی خیال کو نئے پیرایوں اور اچھوتی تشبیہات کے ساتھ بار بار دہراتے ہیں، تاکہ وہ سامع کے ذہن پر نقش ہو جائے۔میر انیسؔ کے بعد اردو کی قلمروِ سخن میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر نظر آئے جس نے اتنی کثرت، ندرت اور تازگی کے ساتھ تشبیہات و استعارات کو برتا ہو جس طرح جوشؔ نے برتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ محض الفاظ کا استعمال نہیں کرتے، بلکہ ان پر مکمل حکمرانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے زورِ بیاں اور لفظی شکوہ نے مرثیے کو ایک نئی فنی بلندی عطا کی ہے۔

شب ہائے این و آں میں ہوئی صبح بادِ مراد ناز سے سنجلی مچلی گلی گلی
عرفانِ کائنات کی اور روحِ ارتقا نے پکارا چٹکی کلی کلی علیؑ علیؑ
لے یہ کلیدِ علم یہ گیتی کا باب ہے
اس خاک کو ابھار کہ تو بوتراب ہے(۳۷)

مندرجہ بالا بحث سے یہ منطقی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جوشؔ کے

مراثی کا اگر عمیق تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو علم و حکمت، تاریخ و مذہب، جہاد و انقلاب، اور عزم و استقلال کے وہ نادر گوشے وا ہوتے ہیں جو کسی بھی عظیم شاعر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہونے چاہئیں۔ ان کے ہاں رزم و بزم کی آمیزش، زبان و بیان کی ندرت، اور لفظ و معنی کا شکوہ اس درجہ اتم موجود ہے کہ قاری ان کے فنی کمال کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوشؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کی کلاسیکی ہیئت کو پامال کیے بغیر اسے بیسویں صدی کے فکری و سیاسی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ انھوں نے ایک ایسی خالص مذہبی صنف کو، جسے ان سے قبل محض حصولِ ثواب اور گریہ و زاری کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا، اپنی فنی گرفت اور انقلابی فکر کے ذریعے 'اوجِ کمال' تک پہنچایا۔ جوشؔ نے مرثیے کو جمود سے نکال کر اسے تحرک اور حریت کا استعارہ بنا دیا اور اس صنف کو ایک ایسا نیا روپ عطا کیا جو عصری معنویت سے بھرپور ہے۔ چنانچہ، اردو ادب میں جدید مرثیے کے معماروں کی جب بھی کوئی فہرست مرتب کی جائے گی، اس میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام بلا شبہ سرِ فہرست رہے گا۔

حواشی

۱۔ محمد عرفان، جوشؔ ملیح آبادی لفظیات و نفسیاتی رجحانات،(دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۹ء)ص ۱۰۶

۲۔ جوشؔ ملیح آبادی ، یادوں کی برات، (کراچی : جوشؔ اکیڈمی ، ۱۹۷۰ء)ص ۳۲۲

۳۔ سید جعفر عسکری، جوشؔ ملیح آبادی کی سیاسی شاعری:برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ ، غیر مطبوعہ مقالہ، شعبہ عمرانیات، جامعہ کراچی، سن ندارد ،ص ۴۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۱-۴۲

۵۔ ایضاً ، ص ۴۵

۶۔ ڈاکٹر سید فضل امام رضوی ، جوشؔ کا عقیدۂ مذہب ، مشمولہ ،جوشؔ ملیح آبادی: خصوصی

مطالعہ ،مرتبہ قمر رئیس، (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵)، ص ۸۳

۷۔ محمد رضا کاظمی ،جدید اُردو مرثیہ،(لاہور:پیس پبلی کیشنز ،۲۰۲۱ء)،ص۸۵-۴۶

۸۔ ایضاً ،ص ۱۳۷

۹۔ علی احمد فاطمی ،جس کو جوشؔ کہتے ہیں ، (کراچی :ورثہ پبلی کیشنز ، ۲۰۲۲ء)، ص۴۵۱

۱۰۔ ایضاً ، ص ۱۴۶

۱۱۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل ، جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں مشمولہ رسالہ جوش شناسی، چھٹا شمارہ، دسمبر ۲۰۰۹، ص۴۲

۱۲۔ ڈاکٹر ہلال نقوی (مرتب)، جوشؔ کے انقلابی مرثیے ،(ناروے:توحید اسلامک سینٹر اوسلو ،۲۰۱۰ء)،ص ۸۰

۱۳۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل ، جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں ، محولہ بالا، ص ۴۴-۴۵

۱۴۔ ڈاکٹر ہلال نقوی (مرتب)، جوشؔ کے انقلابی مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۱۳۹

۱۵۔ یاور عباس ، جوشؔ کے دو عشق، مشمولہ رثائی ادب،شمارہ ۴ ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۶ء، جوشؔ نمبر، ص۳۰

۱۶۔ سید احمد مہدی ،جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی ، کان پور یونیورسٹی، لکھنؤ، سن ندارد، ص ۱۶۷-۱۷۱

۱۷۔ ڈاکٹر ہلال نقوی ،جدید مرثیے کے تین معمار، (کراچی :پاکستان ریڈرس گلڈ،۱۹۷۷ء)،ص ۱۲

۱۸۔ ایضاً (مرتب)، جوشؔ کے انقلابی مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۱۹۴

۱۹۔ پروفیسر احتشام حسین ، جوش: ایک تعارفی مطالعہ، مشمولہ ماہنامہ افکار،(جوشؔ نمبر ،۱۹۶۱ء)،ص ۱۳

۲۰۔ ڈاکٹر ہلال نقوی (مرتب)، جوشؔ کے انقلابی مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۳۰۰

۲۱۔ خلیق انجم(مرتب)،جوشؔ ملیح آبادی کے خطوط،(نئی دہلی:ثمر آفسٹ پرنٹرز،۱۹۹۸ء)ص۱۷۴

۲۲۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی(مرتب) ،کلیاتِ مراثی جوشؔ ملیح آبادی ، (دہلی: فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ، س ن)، ص۵۵

۲۳۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ،جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۱۵

۲۴۔ ایضاً ،ص ۱۶

۲۵۔ محمد رضا کاظمی ،جدیداُردو مرثیہ، محولہ بالا ،ص۸۹-۹۰

۲۶۔ ایضاً،ص ۹۲

۲۷۔ ڈاکٹر ہلال نقوی (مرتب)، جوشؔ کے انقلابی مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۴۴

۲۸۔ محمد رضا کاظمی ،جدیداُردو مرثیہ، محولہ بالا، ص۰۹

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی،جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے ، محولہ بالا ،ص۱۶، ۱۷

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل ، جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں ،محولہ بالا ،ص۵۱-۵۲

۳۴۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ،جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے ، محولہ بالا ،ص ۱۸-۱۹

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً، ص۲۳-۲۴

۳۷۔ ایضاً

مآخذ

۱۔ احسان الحق ،محمد و دیگر ، تحریک وتاریخ پاکستان ، لاہور: علمی کتاب خانہ ،۱۹۸۹ء

۲۔ انجم ،خلیق (مرتب)، جوشؔ ملیح آبادی کے خطوط، نئی دہلی:ثمر آفسٹ پرنٹرز،۱۹۹۸ء

۳۔ انیس ،میر ، منتخب مراثیِ انیس، مرتبہ :خزینہ علم و ادب لاہور ۲۰۱۱ء

۴۔ آفندی ،نجم ، حسینؑ اور ہندوستان، آگرہ: اخبار پریس، ۱۹۳۵ء

۵۔ حسین ،سید احتشام ، جوش ملیح آبادی:انسان اور شاعر،لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی ، ۱۹۸۳ء

۶۔ حسین ،سید صفدر ،مرثیہ بعدِ انیس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء

۷۔ حیدر، اقبال،نادیدنی ہوں جوشؔ ، کراچی : الفاظ فاونڈیشن ،۲۰۱۷ء

۸۔ حیدر ، اقبال و دیگر(مرتب)، مکالماتِ جوش و راغب،کنیڈا: جوش لڑیری سوسائٹی کیلگری، البرٹا،۱۹۸۸ء

۹۔ خان ، کاظم علی(مرتب)، جوشؔ شناسی، لکھنؤ:شیعہ کالج ویکٹوریہ اسٹریٹ،۱۹۸۶ء

۱۰۔ صدیقی ،محمد علی،ڈاکٹر ،جوش ملیح آبادی:ایک مطالعہ ،کراچی: احمد برادرز پرنٹرز ناظم

آباد ، ۲۰۰۶ء

۱۱۔ عرفان ،محمد ، جوش ملیح آبادی لفظیات و نفسیاتی رجحانات،دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۹ء

۱۲۔ عسکری ،سید جعفر ، جوش ملیح آبادی کی سیاسی شاعری :برصغیر میں تحریکِ آزادی پر اثرات کا عمرانی مطالعہ ،غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبۂ عمرانیات ، جامعہ کراچی ، ۲۰۲۲ء

۱۳۔ فاطمی ،علی احمد ،جس کو جوش کہتے ہیں، کراچی :ورثہ پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء

۱۴۔ محمود ،ظفر ، جوش ملیح آبادی:شخصیت اور فن،نئی دہلی : ترقی اردو بورڈ،۱۹۸۹ء

۱۵۔ ملیح آبادی ،جوش ، یادوں کی برات ، کراچی : جوش اکیڈمی ، ۱۹۷۰ء

۱۶۔ _____، کلیاتِ مراثی جوش ملیح آبادی، مولف :ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی: دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۰۷ء

۱۷۔ ملیح آبادی ، عصمت،ڈاکٹر (مرتب) ،کلیاتِ مراثی جوش ملیح آبادی ، دہلی: فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ، سن ندارد

۱۸۔ _____، جوش کی انقلابی نظمیں،لکھنؤ: مکتبۂ دین وادب ،۱۹۸۲ء

۱۹۔ نقوی ،ضمیر اختر،ڈاکٹر ،جوش ملیح آبادی کے مرثیے ، لکھنؤ:نظامی پریس ، ۱۹۸۱ء

۲۰۔ _____، اردو مرثیہ پاکستان میں ، کراچی :شیخ شوکت علی اینڈ سنز آفسٹ پرنٹرز،۱۹۸۲ء

۲۱۔ نقوی ، ہلال،ڈاکٹر ، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان ، ۲۰۰۷ء

۲۲۔ _____، (مرتب)، جوش کے انقلابی مرثیے ،ناروے:توحید اسلامک سینٹر اوسلو ،۱۳۲۰ء

۲۳۔ _____،جدید مرثیے کے تین معمار، کراچی :پاکستان ریڈرس گلڈ،۱۹۷۷ء

۲۴۔ _____،بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ، کراچی :محمدی ٹرسٹ لندن، ۱۹۹۴ء،

رسائل و جرائد :

۱۔ ماہنامہ افکار، جوشؔ نمبر ،۱۹۶۱ء

۲۔ رسالہ جوش شناسی،شمارہ ۴، اپریل ۲۰۰۹ء

۳۔ _____، شمارہ۶، دسمبر۲۰۰۹ء
۳۔ رثائی ادب، شمارہ ۴ ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۶ء، جوشؔ نمبر

غیر مطبوعہ کام

۱۔ مہدی، سید احمد،جوش ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، کان پور یونیورسٹی،لکھنؤ،-----

References:

1. Mohammad Irfan, *Josh Malihabadi: Lafziyat wa Nafsiyati Rujhanat*, (Delhi: Educational Publishing House, 2009) p. 106
2. Josh Malih Abadi, *Yadon ki Barat*, (Karachi: Josh Academy, 1970) p. 322
3. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shayari: Bar-e-Sagheer mein Tehreek-e-Azadi par Asraat ka Umrani Mutala*, Mahula Bala, p. 40
4. Ibid, p. 41-42
5. Ibid, p. 45
6. Dr. Syed Fazl-e-Imam Rizvi, *Josh ka Aqida-e-Mazhab* in *Josh Malihabadi: Khususi Mutala*, Ed. by Qamar Rais (Delhi: Takhleeqkar Publishers, 2005), p. 83
7. Mohammad Raza Kazmi, *Jadeed Urdu Marsiya*, (Lahore: Peace Publications, 2021), p. 46-85
8. Ibid, p. 137
9. Ali Ahmed Fatimi, *Jis ko Josh Kehte Hain*, (Karachi: Virsa Publications, 2022), p. 145
10. Ibid, p. 146
11. Dr. Syed Mohammad Aqeel, *Josh ki Marsiya nigari par kuch Baatein*, in magazine *Josh Shinaasi*, No. 6 (December, 2009), p. 42
12. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh kay Inqalabi Marsiye*, (Norway: Tauheed Islamic Centre Oslo, 2010), p. 80
13. Dr. Syed Mohammad Aqeel, *Josh ki Marsiya nigari par kuch Baatein*, p. 44-45
14. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh kay Inqalabi Marsiye*, p. 139
15. Yawar Abbas, *Josh ke Do Ishq*, in *Risaai Adab*, Issue 4 (October-December 1996, Josh Number), p. 30
16. Syed Ahmad Mehdi, *Josh Malihabadi ki Marsiya nigari*, (unpublished thesis for PhD, Kanpur University, Lucknow), p. 167-171

17. Dr. Hilal Naqvi, *Jadeed Marsiye kay Teen Maimaar*, (Karachi: Pakistan Readers Guild, 1977), p. 12
18. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh ke Inqalabi Marsiye*, p. 194
19. Professor Ehtesham Hussain, *Josh: Ek Ta'arufi Mutala* in Monthly *Afkar* (Josh Number, 1961), p. 13
20. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh kay Inqalabi Marsiye*, p. 300
21. Khaliq Anjum (Ed.), *Josh Malihabadi kay Khutoot*, (New Delhi: Samar Offset Printers, 1998), p. 174
22. Dr. Ismat Malihabadi (Ed.), *Kulliyat-e-Marasi-e-Josh Malihabadi*, (New Delhi: Fareed Book Dept (Pvt) Ltd. n.d.), P. 55
23. Dr. Zameer Akhtar Naqvi, *Josh Malihabadi kay Marsiye*, P. 15
24. Ibid, P. 16
25. Muhammad Reza Kazmi, *Jadeed Urdu Marsiya*, P. 89-90
26. Ibid, P. 92
27. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh kay Inqilabi Marsiye*, P. 44
28. Muhammad Reza Kazmi, *Jadeed Urdu Marsiya*, P. 90
29. Ibid.
30. Dr. Zameer Akhtar Naqvi, *Josh Malihabadi kay Marsiye*, P. 16, 17
31. Ibid.
32. Ibid.
33. Dr. Syed Muhammad Aqeel, *Josh ki Marsiya nigari par kuch Baatein*, P. 51-52
34. Dr. Zameer Akhtar Naqvi, *Josh Malihabadi kay Marsiye*, P. 18-19
35. Ibid.
36. Ibid, P. 23-24
37. Ibid.

Biblpgraphy

1. Irfan, Mohammad, *Josh Malihabadi: Lafziyat wa Nafsiyati Rujhanat*, Delhi: Educational Publishing House, 2009
2. Josh Malih Abadi, *Yadon ki Barat*, Karachi: Josh Academy, 1970
3. Syed Jafar Askari, *Josh Malihabadi ki Siyasi Shayari: Bar-e-Sagheer mein Tehreek-e-Azadi par Asraat ka Umrani Mutala*, Un publuushed Thesis of Ph.D , Department of Sociology, University of Karachi.year not mention, p. 40
4. Dr. Syed Fazl-e-Imam Rizvi, *Josh ka Aqida-e-Mazhab* in *Josh Malihabadi: Khususi Mutala*, Ed. by Qamar Rais, Delhi: Takhleeqkar Publishers, 2005

5. Mohammad Raza Kazmi, *Jadeed Urdu Marsiya*, Lahore: Peace Publications, 2021
6. Ali Ahmed Fatimi, *Jis ko Josh Kehte Hain*, Karachi: Virsa Publications, 2022
7. Dr. Hilal Naqvi (Ed.), *Josh kay Inqalabi Marsiye*, Norway: Tauheed Islamic Centre Oslo, 2010
8. Dr. Hilal Naqvi, *Jadeed Marsiye kay Teen Maimaar*, Karachi: Pakistan Readers Guild, 1977
9. Khaliq Anjum (Ed.), *Josh Malihabadi kay Khutoot*, New Delhi: Samar Offset Printers, 1998
10. Dr. Ismat Malihabadi (Ed.), *Kulliyat-e-Marasi-e-Josh Malihabadi*, New Delhi: Fareed Book Dept (Pvt) Ltd. n.d.

Unpublished work

1. Mehdi, Syed Ahmad, *Josh Malihabadi ki Marsiya nigari*, unpublished thesis for PhD, Kanpur University, Lucknow, year of publication, not present.

Journals and papers

1. Monthly *Afkar*, Josh Number, 1961
2. Quarterly *Josh Shinasi*, Karachi, No. 4, April 2009 (Josh Seminar Number)
3. Quarterly, *Josh Shinasi*, Karachi, No. 6, December, 2009
4. Quarterly *Risaai Adab*, No. 4, October-December, 1996 (Josh Number)